

خوفناك الزام



اشتياق احمد

محمد فرحان
جماعت ششم بلوچ

کتاب ۲ - ۶۵

۷۹۱
۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

منی خاص نمبر ۳۲۸



اشتیاق احمد

ہازی بک مطبعہ

طالب مارکیٹ گلبرگ، لاہور

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: اس شخص کی ناک خاک آلود ہو (یعنی وہ ذلیل و خوار ہو) جس نے اپنے ماں باپ میں سے ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور جنت میں داخل نہ ہوا (یعنی ان کی خدمت نہ کی اور اس طرح جنت حاصل نہ کی) — (مسند امام احمد)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی رضا ماں باپ کی رضا مندی میں پوشیدہ ہے اور اس کی ناراضی ماں باپ کی ناراضی میں پوشیدہ ہے۔ — (ترمذی)

حضرت ابی اسید الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ قبیلہ بنی سلمہ کا ایک شخص آیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، میرے ماں باپ کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان کے ساتھ نیکی کرنے کی کوئی صورت باقی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں ہے، ان کے لیے دعا کرتے

محمد حقوق بختہ پبلشرز محفوظ ہیں

نام ناول — خوف ناک الزام
طابع — اشتیاق احمد
بار اول — اگست ۱۹۸۹ء
مطبع — زاہد بشیر پریٹرز لاہور
قانونی مشیر — ملک محمد اکرم ایڈووکیٹ
سرودق — محمد جاوید چغتائی
کتابت — سعید نامدار، اکرم چوہان
قیمت — [REDACTED]
سالانہ قیمت — [REDACTED]

اشتیق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد — مسلم پورہ — ساندھ کلاں — لاہور

فون نمبر: 321537

رہنا، ان کی مغفرت کے لیے التجا کرنا اور ان کے وعدوں کو ان کی وفات کے بعد پورا کرنا (یعنی اگر وہ زندگی میں کسی سے کوئی وعدہ کر گئے ہیں تو اس وعدے کو پورا کرنا) محض ان کے تعلقات کی بنا پر صلہ رحمی کرنا (یعنی ان کے دوست احباب کے ساتھ اچھا سلوک کرنا) اور ان کے دوستوں کی عزت و تکریم کرنا (یعنی یہ کام کر کے فخر ہو جانے کی صورت میں بھی ماں باپ کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے) (ابوداؤد، ابن ماجہ)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کے عذاب کو حرام کر دیتا ہے۔

وضاحت: اللہ کی رضا کے لیے کلمہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارے۔ یعنی کسی بھی قسم کا شرک ہرگز نہ کرے۔



دوباتیں

السلام علیکم!

"خوف ناکہ الزام" کہ دو باتیں ہیں۔ اس بار ہم چند خطوط کا تذکرہ کریں گے۔ "غار کا کنواں" کے سلسلے میں ایک اور صاحب محمد اجمل غافلہ زنگر، بازار صرافہ، چنیوٹ نے خط لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں چند باتیں احادیث کے حوالہ سے لکھی ہیں، لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ احادیث کہاں سے لی گئیں، احادیث کے کتابوں کا نام کیا ہے۔ ان کے کس صفحے پر یہ احادیث درج ہیں، جب تک حوالہ جات اور صفحہ نمبر نہ لکھے جائیں گے، ان کا خط شائع نہیں کیا جاسکتا۔ نہ جو جواب دینے کے کوئی ضرورت ہے، کیونکہ ہم نے جو چیز شائع کی ہے، مکمل ترین شوق کے ساتھ شائع کی ہے۔ تمام قارئین اپنے آنکھوں سے یہ تمام شوق دیکھ چکے ہیں۔ اب بغیر شوق کے باتیں کرنا، ہوائی قلعے تعمیر کرنا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ مخالفین کے پاس جواب میں کچھ نہیں ہے، اس لیے فرض باتیں کر سکتے ہیں۔ خوف کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیا خیال

ہے آپ صبح کا۔

ایکے اور خط اس کے سلسلے کا ملا ہے۔ اللہ کا نام محمد صادق (پاکہ) سٹور نزد کھتری مسجد پٹھان اور کراچی ۱۲ ہے۔

غار کا کنواں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فرضیہ باتیں کہ ہیں، نہ کبھی حدیث کا حوالہ لکھا، نہ آیت کا۔

بس دو مزے دار باتیں لکھی ہیں، وہ آپ بھی پڑھ لیں تاکہ

معلوم ہو جائے۔ مخالفین۔ (یعنی دیخ کے مخالفین) کتنے

پانف یہ ہیں۔ لکھتے ہیں، آپ نے غار کا کنواں میں جو

احادیث درج کی ہیں۔ اللہ کے ترجمے غلط ہیں اور دوسری

باقی اس سے بھی مزے دار لکھی ہے کہ بعض حوالے بھی

غلط ثابت ہوئے ہیں۔ یہ پڑھ کر حد درجے ہنس اٹے۔

آپ نے تو غار کا کنواں پڑھا ہے، اس میں اصل کتابوں

کے فوٹو سٹیٹ شائع ہیں۔ حوالے تو کہیں بھی نہیں دیے

اور اگر اللہ فوٹو سٹیٹ کو بھی انھوں نے حوالے لکھا ہے تو

یہ ہمارے لیے بہت خوشی کہ باقی ہے۔ اب یہ اپنی باقی

ثابت کریں، کبھی حدیث کا ترجمہ غلط ہے۔ عربی عبارت

ساتھ ساتھ درج ہے۔ اور کوفہ سے حوالے غلط ہیں۔

ثبوت خط میں بھی دے دیتے۔ تاکہ دوبارہ زحمت نہ کرنا

پڑے۔ لیکن اصل باقی یہ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں ہیں

نہیں ہوتے۔ ثبوت کہاں سے آئے۔

محمد عظیم شیخ، اے ۵۲۲ ہلاک ہے، نار تھ ناظم آباد، کراچی نے

ایک طویل خط لکھا ہے۔ وہ خط اور جواب جو دیا گیا۔

آپ نادول کے آخر میں پڑھ لیں۔ ویسے یہ خط خوشی کا ہے۔

ہمارے ایک قادی کے بھائی انتخاب رسول کو عیسائیت

کے طرف سے ایک پرنٹڈ لیٹر ملا ہے۔ اس کے فوٹو سٹیٹ آخر

میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ آپ ہوشیار رہیں اور ایسی

چیزوں کو فوراً پھاڑ کر پھینک دیں۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ ترین

دین ہے۔ ہمیں اسلام کے بعد کبھی پرانے دین کے قطعاً کوئی

ضرورت نہیں۔ اسلام تو سب سے آخری دین ہے۔ آخری

رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مخلوق کو دیا گیا۔

اس دین کے بعد کوئی دین نہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد کوئی نبی نہیں۔ تو پھر یہ عیسائی کون ہوتے ہیں مسلمانوں

کو عیسائیت کے تبلیغ کرنے والے۔ ہمارے حق بنتا ہے کہ

انھیں تبلیغ کریں، کیونکہ انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے

اعلان فرمادیا تھا کہ ایک آخری نبی بھی آئے گا۔

اللہ کے پروردگار کرنا ہوگا۔ لیکن آج جملہ انجیلوں سے یہ الفاظ

نکال دیے گئے ہیں۔ چھ سو سال پہلے کے انجیلوں کو

کھول کر عیسائی یہ حقیقت کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ اور ایک

تھے دیف اور تھے رسول صلوات اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اپنی
آخرت کیوں نہیں سنوار لیتے۔ اللہ کے مخلوق کو گمراہ کر کے
سوائے جہنم کے اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آنے کا۔

احسن زمان سلیم صاحب محلہ سپرالہ، گلہ گلہاٹیا، وزیر آباد
ضلع گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں کہ حکومت نے ہمارے ضلع گوجرانوالہ
میں پیپلز پروگرام کا ایڈمنسٹریٹر ایکے قادیانی کو بنایا ہے۔ اس
پر یہاں کے مخلوق میں کافی بے چینی پائی جاتی ہے۔
آپ کے اطلاع کے لیے شکریہ۔ باقی ختم ہوتے کے ناظم اعلیٰ صاحب
کے علم میں لائی جا رہی ہے۔

محلہ کے تلامذہ کے دو باتیں میں تینہ قریشی سے کمری
کمری باتیں کہ گئے تھیں۔ دو ماہ تک تو انھوں نے چپے
سادے رکھے۔ اب پھر ایک خط لکھا ہے، لیکھ اس خط میں
اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے جو ان سے کیا گیا تھا۔
محلہ کے تلامذہ کے دو باتیں کا صفحہ نمبر ۱۰ ملاحظہ فرمائیے۔
ان سے پوچھا گیا تھا کہ ان کے جھوٹے نبی کا بیان درست
ہے یا ان کا اپنا؟ کیوں کہ دونوں بیانات میں اختلاف ہے۔
اگر ان کا بیان درست ہے تو مرزا خود بخود جھوٹا ثابت ہو
گیا اور اگر مرزا نے درستہ لکھا ہے تو یہ تینہ قریشی تو
جھوٹے ہو ہی گئے۔ اب ذرا وہ حدیث ہمیں بھی دکھا

دیو، لیکھ تینہ قریشی نے اپنے خط میں کسی حدیث کا
سرے سے ذکر نہیں کیا۔ بے حوالہ باتیں لکھ دی ہیں۔
جب کہ ہم نے تمام باتیں حوالہ جات کے ساتھ لکھی تھیں۔
ثابت ہوا کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ جواب لکھنا ہے۔
تو کسی حدیث کا حوالہ بھی تو دیو۔ کیا یہ لکھ دینا کافی ہے
کہ حدیث ہے کہ.....

اب یہ حدیث ہے کہا۔ اس کا ذکر سرے سے نہیں
ہے۔ ہے کوئی ٹک۔ لیکھ باقی نہیں۔ صرف یہ ہے کہ
جھوٹے لوگ ہمیشہ بے پر کہ اڑاتے ہیں۔ پر کہ ان کے
پاس ہوتے، تو نہیں۔ تو اڑائیں گے کیے۔ ایک بار پھر
ان حضرات کو چیلنج ہے۔ باقی مع ثبوت کے لکھیں۔

محترم یاسین شیخ آپ کا خط ملا، لیکھ آپ کے خط پر پتا
درج نہیں ہے۔ جوابی لفافے پر آپ نے پتا
لکھا، اس لیے جواب دینے سے معذور ہوں۔
آپ فوری طور پر اپنا پتا خط پر لکھیں۔ تاکہ جواب
دیا جاسکے۔

آپ لوگ جس لفافے میں خط ارسال کرتے ہیں۔
وہ عام طور پر منہال کر نہیں رکھے جاتے۔ اس لیے اپنا
خط ختم کرنے کے فوراً بعد اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔

یہی تمام دو باتیں خطوط کے نذر ہو گئیں۔ اب میرے
لئے کیا رہ گیا۔ خیر آئندہ ماہ سہ —
"ماضی زبرد" کے اشتہار میں قیمت ۸/۰۰ روپے لکھی گئی
جبکہ یہ ناول زیادہ ضخامت کا تھا اور قیمت ۱۲/۰۰ روپے
تجویز کی گئی تھی۔ لہذا آپ خریدتے وقت یہ بات
ذہن میں رکھیں کہ قیمت ۸/۰۰ روپے غلطی سے لکھی گئی
تھی۔

"پیغام کا جھوٹ" صفحہ نمبر ۱، سطر نمبر ۴ پر اس طرح پڑھا جائے:
بلکہ عقیدہ ہے جو ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ابھی ان کا
ایک اور بزرگ آئے گا جو ساری دنیا کا حکمران ہو گا اور وہ
ایک غار میں موجود ہے، اسی غار سے برآمد ہو گا۔ یہ لوگ
اپنے اس بزرگ کے لیے راستا ہموار کر رہے ہیں۔

—
—
—

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
 - آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
 - کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
 - آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
 - آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بقیہ ہو
تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے
کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص
اشتیاق احمد

ترتیب

جاسوسی کی ضرورت

کیمرے والا

سنہری زنجیر

چوری کا وقت

وہ چیز

نیا جھٹکا

کیا کہا

ہمارے ملک میں رہ کر

آؤ جہتی چلیں

یہ مرچکا ہے

لات کا انجام

حیرت

ایک بات اور

۲۵.۸.۸۹

جاسوسی کی ضرورت

”آج تمہیں ایک گھر میں چوری کرنا ہے۔ انپکٹر جمشید نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

”جی کیا فرمایا۔ چوری کرنا ہے۔ یہ ہم نے چوریاں کب سے شروع کر دیں۔ اور آپ ہم سے یہ کام کب سے لینے لگے۔ فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

”آج سے اور اسی وقت سے۔ تم یہ بتاؤ۔ چوری کر رہے ہو یا نہیں۔“ انپکٹر جمشید نے بڑا سا منہ بنایا۔

”آپ کا حکم ہو اور ہم چوری نہ کریں۔ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”لیکن اس گھر میں چوری کرنا آسان کام نہیں ہو گا۔“
”آپ فکر نہ کریں ابّا جان۔ ہم مشکل سے مشکل کام بھی کر گزریں گے۔“ محمود نے فاروق کو گھورا۔

”اس گھر کے گرد زبردست پہرا ہے۔ ملٹری اور پولیس دونوں کا۔ اندر بھی بے ستاشا حفاظتی انتظامات ہیں۔ اب کیا کہتے ہو۔“ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اوہو اچھا۔ لیکن ایسے کسی گھر میں آپ کو چوری کرانے کی ضرورت کیا پیش آ گئی۔“ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس آ گئی پیش۔ بتا نہیں سکتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تم وہاں چوری کرو گے اور فلاں چیز اڑا کر لاؤ گے۔ لاؤ گے بھی اس طرح کہ پکڑے نہ جا سکو۔“

”گویا دیکھ لے جانے کی کوئی پروا نہیں۔“ محمود نے پوچھا۔

”ہاں! گھر کے افراد تمہیں دیکھ ضرور لیں۔ اگر امضوں نے تمہیں نہ دیکھا۔ تو پھر مزا نہیں آئے گا۔“

”لیجیے۔ یہ مزے صاحب کہاں سے ٹپک پڑے۔“ فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مزے سے پوچھو۔“ انپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”وہ تو شاید امی جان کے ساتھ باورچی خانہ میں ہو گا۔“ فاروق بولا۔

”لگ۔ کون۔ ہو گا میرے ساتھ۔“ دوسری طرف سے آتی ہوئی بیگم جمشید بڑی طرح گھبرا گئیں۔

”نچ۔ جی۔ مزا۔“ فاروق مسکرایا۔

”کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔“ وہ جھلّا اٹھیں۔

”کر لینے دو بیگم۔ آج یہ ایک بہت ہی اہم ہم سرانجام دینے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ وہاں سے لوٹ کر نہ آ سکیں۔“ انپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”ہائیں۔ کیا کہا۔ آپ کا مطلب ہے۔ شاید وہاں سے زندہ بچ کر واپس نہ آ سکیں۔“

”تم یہ بھی کہہ سکتی ہو۔“ وہ بولے۔

”لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ کے جملے کا مطلب کچھ اور ہے۔“

”پتا نہیں میرے جملے کا کیا مطلب تھا۔ میں ذرا ان سے بہت ضروری بات کر رہا ہوں۔“

”آپ۔ آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ میں یہاں سے ہٹ جاؤں۔“ بیگم جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”ہاں! میں یہی کہنا چاہتا تھا۔ وہ بات اس قدر ضروری ہے کہ خود میں بھی بتا کر مہجول جانا چاہتا ہوں، تاکہ مجرم مجھے اغوا کر لیں، تب بھی مجھ سے کچھ نہ معلوم کر سکیں۔“

”آج تو آپ حیران پم حیران کر رہے ہیں۔“ بیگم جمشید بولیں۔

”اندر کمرے میں جا کر جتنا جی چاہے حیران ہو لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ انھوں نے مسکرا کر کہا اور بیگم جمشید برا سا منہ بناتی چلی گئیں۔

”ہاں تو بھئی۔ میں کیا کر رہا تھا۔“

”اس قدر عجیب باتیں۔ کہ آپ نے شاید آج تک نہ کہی ہوں گی۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”میں بات پوچھ رہا ہوں۔ کیفیت نہیں۔“

”آپ کہہ رہے تھے، اس گھر کے گمرد پولیس اور فوج کا زبردست پہرہ ہے۔ اور جو چیز ہمیں اڑا کر لانا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ہی یہ تمام انتظامات کیے گئے ہیں۔“

”ہاں! ایک اور مزے کی بات بھی سن لو۔“

”خیر۔ اگر آج کا دن ہے ہی مزے کی باتوں کے سننے کا تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ فرزانہ بولی۔

”مجھے تو واقعی بہت مزا آ رہا ہے۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”بہتر ہو گا کہ اس مزے کو کسی پلیٹ میں جمع کرتے

رہو۔ تاکہ بعد میں بھی لطف اٹھایا جا سکے۔“ فاروق جل

کر بولا۔

”اب ذرا غور سے سن لو۔ لیکن نہیں۔ پہلے نہیں یہ

دیکھ لینا چاہیے کہ کوئی ہمارے گھر کے آس پاس تو موجود نہیں ہے، بلکہ کوئی شخص کچھ فاصلے پر بھی تو نہیں کھڑا۔“

”جی کیا مطلب۔ اگر کوئی کچھ فاصلے پر کھڑا ہو تو اس سے ہمیں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔“

”وہ وہاں کھڑے ہو کر بھی تو آوازیں سن سکتا ہے۔“

”اوہ ہاں! یہ تو ہے۔ خیر ہم چیک کر لیتے ہیں۔“ محمود

نے کہا۔

”صرف تم باہر جاؤ گے۔ اور چاروں طرف کا جائزہ لے

کر آؤ گے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود گھر سے نکل گیا۔ اس نے سرسری انداز میں چاروں

طرف کا جائزہ لینا شروع کیا، لیکن یہ بظاہر سرسری انداز

تھا۔ ورنہ وہ بہت غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ آخر

بکر لگا کر وہ واپس آ گیا۔

”باہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”یہ بات تم اتنے یقین سے نہ کہو۔“ اچانک فرزانہ

بولی۔

”کیوں نہ کہوں۔ جب کہ میں غور سے جائزہ لے آیا

ہوں۔“

”ابا جان! کیا آپ ایک دو منٹ کے لیے مجھے اجازت

وہیں گے۔ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔
 ”تم کیا کرو گی۔“ ان کے لمبے میں حیرت تھی۔
 ”بس دیکھتے جائیں۔“ وہ مسکرائی اور اٹھ کر دروازے کی
 طرف بڑھی۔

”دیکھتے کیسے جائیں۔ تم تو باہر کا رخ کر رہی ہو۔“
 فاروق نے منہ بنایا۔
 ”بھئی عقل کی آنکھیں استعمال کر لو نا۔“ اس نے مڑ کر کہا
 اور پھر باہر نکل گئی۔
 ”اوہ ہاں۔ عقل کی آنکھیں۔“ ان کو تو میں بھول
 ہی گیا۔“

”یہی تو تم میں بُری بات ہے۔ ہمیشہ کام کی بات کو
 بھول جاتے ہو۔“ محمود مسکرایا۔
 ”اب دیکھیں۔ یہ صاحبہ کیا تیر مار کر آتی ہیں۔“ فاروق
 بولا۔

”میرا خیال ہے۔ اسے کوئی خاص خیال آیا ہے۔“ وردہ
 باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ”انپکٹر جمشید نے کہا۔
 ”لیکن آبا جان۔ میں دیکھ آیا ہوں۔ باہر کسی خاص خیال
 کی دال بھی گلتی نظر نہیں آئی۔“ محمود بولا۔
 ”یہیجی۔ اب خیال کی بھی دال گھٹنے لگی۔ حد ہو گئی۔“

دو منٹ بعد فرزانہ اندر داخل ہوئی تو اس کے چہرے
 پر جوش نظر آ رہا تھا:
 ”میرا خیال درست نکلا۔“
 ”لیکن کون خیال۔“ فاروق بولا۔

”میں نے سوچا تھا۔ آس پاس کھڑے ہونے کی بجائے۔
 مجرم صاحب بیگم شیرازی کے گھر کے اندر بھی تو موجود ہو
 سکتے ہیں۔“ یہ جملہ فرزانہ نے اشاروں میں کہا۔
 ”اوہ!“ وہ بھی اشاروں میں حیران ہوئے۔ اور پھر
 انپکٹر جمشید کے کان سے فرزانہ کا منہ لگ گیا۔ وہ نہایت
 مدہم آواز میں انہیں بتانے لگی۔

”میں نے بیگم شیرازی کے دروازے پر دستک دی تو
 اندر سے انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ کون ہے،
 میں بہت مصروف ہوں۔ نہیں آ سکتی۔ پھر کسی وقت آنا،
 اس پر میں نے کہا کہ فرزانہ ہوں۔ میرا نام سن کر بھی
 انہوں نے یہی کہا کہ پھر آنا۔ اور اس سے صاف ظاہر
 ہے کہ اندر گڑ بڑ ہے۔“

انپکٹر جمشید نے سر ہلا دیا اور اٹھ کر کھڑے ہو
 گئے۔ انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ بیگم شیرازی کے دروازے
 پر آ کر انپکٹر جمشید نے دستک دی۔

”لگ۔ کون ہے۔“ ان کی پریشان پریشان سی آواز سنائی دی۔

”میں ہوں۔ دروازہ کھولیں۔“

”میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔“

”لیکن مجھے بھی آپ سے بہت ضروری کام ہے۔“

”افسوس! اس وقت میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔“

”اچھا خیر۔“ انھوں نے کہا اور واپس مڑنے اور جانے کی

آواز پیدا کرتے اپنے دروازے تک آ گئے۔

”اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم چھت کے

راستے جائیں۔“ انھوں نے اشارے میں کہا۔

اس قسم کا انتظام انھوں نے پہلے ہی کر رکھا تھا

لہذا اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور چھت

پر آ گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ بیگم شیرازی کی چھت

پر آواز پیدا کیے بغیر اتر چکے تھے۔ زمین کا دروازہ

بند تھا، لیکن انھیں بھلا اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔

پوشیدہ جگہ سے انھوں نے رسی نکالی اور نیچے لٹکا دی

فاروق رسی کو پکڑ کر لٹک گیا اور بھلتا چلا گیا۔ جلد ہی

اس کے پاؤں فرش پر جا گئے۔ اب اس نے اوپر آ کر

زمین کا دروازہ کھول دیا۔ چاروں دبے پاؤں بیگم شیرازی

والے کمرے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت انھوں نے ایک آواز سنی:

”میرا خیال ہے۔ یہ لوگ مایوس ہو کر واپس جا چکے

ہیں۔“

”نہج۔ جی ہاں! یہی کہا جا سکتا ہے۔“

”کیا خیال ہے۔ انھیں شک تو نہیں ہو گیا؟“

”پتا نہیں۔“ بیگم شیرازی بولیں۔

”معاذ گڑ بڑ ہی لگتا ہے۔ اس لیے تو اب ان کی

آوازیں سنائی نہیں دے رہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہو گئے ہوں۔“

”لیکن انپکڑ جمشید اور بیگم جمشید کو تو ساتھ نہیں جانا

تھا۔“

”اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم میری جان کب چھوڑو

گے۔“

”ابھی کچھ دیر اور لگے گی۔ جب تک۔“

اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ کیوں کہ

اسی وقت چاروں دروازے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔

”ہم آ گئے ہیں۔“

”اوہ۔ اوہ۔ اللہ تیرا شکریہ ہے۔“ بیگم شیرازی نے خوش

ہو کر کہا۔

انھوں نے دیکھا۔ ایک لمبے قد کا آدمی پستول بیگم شیرازی کی طرف تانے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر چھوٹا سا ٹالسٹا رکھا تھا۔

”گویا تم ہمارا پروگرام سننے کے لیے یہاں آئے بیٹھے ہو۔“

اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

”تمہارا چہرہ جانا پہچانا نہیں ہے۔ چلو نام بتا دو۔“

”میں گلاب خان ہوں۔“ اس نے بھٹکا کر کہا۔

”شکل سے تو گو بھی خان لگتے ہو۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”خبردار! میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ پستول میرے ہاتھ میں ہے۔“

”اوہو اچھا۔ اس بات کا تو ہمیں خیال ہی نہیں رہا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”بائیں۔ کہیں ہم سے کوئی زبردست غلطی تو... سرزد نہیں ہو رہی۔“ ایسے میں فرزانہ بولی۔

”کیا مطلب؟“

”ایک منٹ۔ میں ابھی آئی۔“ اس نے کہا اور تیزی سے

مڑی۔

”خبردار! حرکت نہ کرنا۔“ گلاب خان چلا یا۔

لیکن فرزانہ تو اس کے چلانے سے پہلے ہی دروازے کے سامنے سے ہٹ چکی تھی۔ ساتھ ہی گلاب خان کے پستول سے گولی چلی۔ تینوں دھڑام سے گرے۔ اور لوٹ لگا گئے۔

ساتھ ہی انھوں نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

گویا فرزانہ باہر نکل رہی تھی۔ اسی وقت گلاب خان نے باہر

کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ جانتے تھے۔ باہر آتے ہی

وہ پھر فائرنگ کرے گا۔ لہذا وہ لڑھکتے چلے گئے تھے

اور اس وقت تک صحن والی دیوار کی اوٹ لے چکے تھے۔

”بس۔ بھاگ گئے۔ بڑے بہادر بنتے تھے۔“

”بھاگے نہیں ہیں۔ یہیں ہیں۔ لیکن ہم تمہیں زندہ پکڑنے

کے چکر میں ہیں۔ ورنہ یہ دیکھو۔ میری ایک ہی گولی تمہارا

نام تمام کر سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اس

کے پیروں کے پاس ایک عدد فائر جھونک مارا۔ اس کی

میخ نکل گئی۔ وہ بُری طرح اچھلا اور ساتھ ہی محمود

نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی لات اس کے پیٹ

میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ فرش

پر گر کر ترپنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ پُرسکون انداز میں

لیٹا ان کی طرف دیکھ رہا تھا:

”محمود۔ فاروق۔ تم فزانہ اور اپنی امی کی خبر لو۔“

”جی بہتر۔“ دونوں باہر کی طرف بھاگے۔

ان کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ فزانہ صحن میں بے ہوش پڑی تھی اور بیگم جمشید کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ دونوں نے جلدی جلدی سارے گھر کا چکر لگایا۔ پھر فزانہ کو اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ اور باہر کی طرف دوڑے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق جاری تھی اور کوئی گاڑی تیز رفتاری سے جاتی محسوس نہ ہوئی۔

”حیرت ہے۔ اس قدر جلد وہ امی جان کو کیسے لے گئے؟“

محمود بڑبڑایا۔

”ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کسی دوسرے گھر پر بھی قبضہ

کر رکھا ہو۔“ فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

”اوہ ہاں! ضرور یہی بات ہے۔ اور وہ گھر ضرور شیخ

صاحب کا ہو گا۔ آؤ۔“

وہ پھر اپنی چھت پر آئے اور دوسری طرف والی چھت پر اتر گئے۔ اس کا زینہ بھی بند تھا۔ لیکن انھوں نے ہار مانا کب سیکھا تھا۔ محمود فوراً بیگم شیراز کی چھت پر گیا اور رستی کھول لایا۔ جلد ہی وہ شیخ صاحب کے صحن میں اتر

چکے تھے۔ ایک کمرے میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

وہ دبے پاؤں اس طرف بڑھے۔ دروازہ بند تھا۔ انھوں نے کان لگا دیے۔

”اب ہم رات کی تاریکی میں ہی۔۔۔۔۔ یہاں سے نکل سکیں گے۔“

”اُٹ مالک۔ گویا رات تک۔“ انھوں نے شیخ صاحب کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔

”ہاں! آپ لوگوں کو رات تک اسی حالت میں رہنا ہو گا۔ بلکہ جاتے ہوئے تو ہم آپ لوگوں کے منہ بھی بند کر کے جائیں گے۔ ویسے آپ انیکٹر جمشید کو بتا دیجیے گا کہ اب بیگم جمشید کی تلاش میں ساری زندگی بھٹکنا ہو گا۔“

”بب۔ بتا دوں گا۔“ شیخ صاحب کانپ کر بولے۔

محمود نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے فاروق کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ رہا ہو۔ اب کیا کریں بھئی۔

فاروق نے آؤ دیکھا نہ تارا۔ دروازے پر دستک دے ڈالی۔ اندر ایک دم سناٹا طاری ہو گیا، پھر چند سیکنڈ بعد شیخ صاحب کی آواز سنائی دی:

”کک۔ کون؟“

”یہ ہم ہیں شیخ صاحب — دروازہ کھول لے۔“
 ”حم — میں — دروازہ نہیں کھول سکتا — تم پھر کسی وقت آنا۔“

”ہم سب کچھ سن چکے ہیں — اور جانتے ہیں — یہ لوگ ہماری امی کو اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں — اب ہم انھیں نہیں بھڑیں گے۔“

”بہت خوب — یہ ہوئی تا بات — لیکن بھئی — تم لوگ عقل سے بالکل پیدل ہو — اندر سے چپکتی آواز آئی۔“
 ”وہ کیسے؟“ محمود نے بھٹا کر کہا۔

”اس طرح کر — اس وقت ہمارے ہاتھوں میں پستول ہیں، اور ان کے رخ متھاری امی کی طرف ہیں — اب اگر تم نے کوئی ذرا بھی حرکت کی — تو کم از کم اپنی والدہ کو تو زندہ نہیں پاؤ گے — رہ گئے ہم — ہم بھی آخر موم کے بنے ہوئے تو ہیں نہیں۔“
 ”اوہ!“ ان کے منہ سے نکلا — پھر محمود نے بلند آواز میں کہا۔

”کیا یہ سچ کہہ رہا ہے امی جان۔“

”ہاں! اس وقت دو پستول مجھ پر تنے ہوئے ہیں، لیکن تم پریشان نہ ہو — موت اور زندگی تو بس اللہ کے ہاتھ

ہے۔“ وہ بولیں۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں — فاروق — تم پولیس کو فون کر دو۔ یہ تمام علاقہ اب پولری طرح پولیس کے گھیرے میں ہونا چاہیے۔“ محمود نے بلند آواز میں کہا۔
 ”کچھ بھی کرو۔ جب تک ہمیں یہاں سے بحفاظت نکلنے نہیں دیا جائے گا — تمھاری والدہ کی زندگی خطرے میں رہے گی۔“

”نہیں دوست! ہم تمھیں نکلنے نہیں دیں گے۔“ محمود نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

فاروق فون کرنے کے لیے جا چکا تھا — اچانک دروازہ کھلا اور کوئی محمود پر آ پڑا — محمود کم از کم اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا — وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حملہ آور اس کی والدہ کے پاس سے ہٹ کر اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے — وہ دھڑام سے گرے، حملہ آور نے ایک مکا اس کے سر پر رسید کیا، اور دروازے کی طرف بھاگا — محمود کا سر چکرا کر رہ گیا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک زور دار چکر آیا — اس نے سر کو ایک زبردست جھٹکا دیا اور اٹھنے میں کامیاب ہو گیا — اب وہ بے تحاشا دروازے کی طرف جھپٹا،

اس وقت تک حملہ آور بیردنی دروازے پر پہنچ چکا تھا۔
 اس نے جو اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ بھڑک
 کر مڑا۔ اور پھر محمود پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔
 لیکن عین اسی وقت اس کی کمر پر ایک زبردست ٹھوکر
 لگی اور وہ اوندھے منہ گرا۔ تیزی سے اٹھا تو محمود
 سامنے تھا اور اس کے چہرہ پر ایک دلکش مسکراہٹ
 تھی۔ اس کے پیچھے فاروق تھا۔ جو شاید آواز سن
 کر داپس ہی پٹ آیا تھا۔ محمود نے اب اسے مہلت
 دینا مناسب نہ سمجھا اور اچھل کر سر کی ٹکر اس کے
 سینے میں دے ماری۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے
 تیزی سے جھکائی دی۔ لیکن محمود کی ٹکر سے بچ نہ
 سکا۔ الٹ کر گرا۔ اس طرف فاروق تیار تھا۔ اس کی
 ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگی۔ اور پھر ایک منٹ بعد وہ
 بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ دونوں نے جلدی جلدی
 اسے باندھا۔ اور بیگم شیرازی کی طرف دوڑے۔ پھر اکرام
 کو فون کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر کے صحن
 میں دونوں مجرموں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اکرام بھی اپنے
 ماتحتوں کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا اور حیرت زدہ انداز
 میں ان سب کو دیکھ رہا تھا :

”یہ۔ یہ سب کیا چکر ہے سر۔“
 ”یہ لوگ ہماری جاسوسی کر رہے تھے۔ یعنی جاسوس کی
 جاسوسی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ لیں انکل کہ چوروں کو
 مور ٹکمرہ لگنے۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔
 ”کیا کہ رہے ہو۔ ہم چور ہیں۔“ محمود نے جھلا کر کہا۔
 ”وہ۔ وہ میرا مطلب تھا۔ محاورہ۔“ فاروق گھبرا گیا۔
 ”ہرگز نہیں۔ ہم محاورہ“ بھی چور نہیں ہیں۔“
 ”سوال یہ ہے کہ ان دونوں کو جاسوسی کی ضرورت کیوں
 پیش آ گئی۔“ انیکٹر جمشید نے کہا اور ان کی نظریں دونوں
 پر جم گئیں۔
 عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

یکمرے والا

انھوں نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا
آنے والا اجنبی ہی ہو سکتا تھا، آخر انپکٹر جمشید بولے :
”دیکھو بھئی۔“

محمود اٹھ کر دروازے کی طرف گیا، اس نے دیکھا، باہر
ایک دبلا پتلا اور لمبا سا آدمی کھڑا تھا۔ وہ اس قدر دبلا پتلا
تھا کہ دور سے دیکھنے پر بانس ہی نظر آ سکتا تھا اور ایسا
اس کی لمبائی کی وجہ سے تھا۔ اگر وہ اتنا لمبا نہ ہوتا تو
اس قدر دبلا نظر نہ آتا۔ اس کی آنکھوں پر عینک بھی تھی
جی فرمائیے! محمود نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

”انپکٹر جمشید صاحب؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں! یہ اٹھنی کا گھر ہے۔“

”مجھے ان سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ بس میں ان

کے صرف چند منٹ لوں گا۔“

”آئیے۔“ اس نے کہا اور اسے لیے اندر آ گیا۔

”انھیں آپ سے کام ہے۔ صرف چند منٹ کا۔ ڈرائنگ

روم میں بٹھادیں۔ یا یہیں بات کہیں گے۔“

”یہیں ٹھیک ہے۔ اگر انھیں علیحدگی میں بات نہ کرنا ہو۔“

”جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ مسکرایا۔“

”تو پھر تشریف رکھیے۔ آپ کی تعریف۔“

”میں جانِ عالم ہوں۔ آپ کے شہریں ہی رہتا ہوں۔“

اون کا کاروبار ہے میرا۔ چند دنوں سے ایک عجیب قسم کی

پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔“

”جہاں تک مجھ سے ہو سکا۔ آپ کے کام آنے کی

کوشش کروں گا۔“

”شکریہ۔ بہت بہت۔ میرے پاس اون کے چار گودام

ہیں۔ تین دن پہلے ایک گودام میں آگ لگ گئی۔ میں نے

اسے ایک اتفاقی حادثہ خیال کیا، دو دن پہلے دوسرے میں

آگ لگی تو میں گھبرا گیا اور حیرت زدہ رہ گیا اور کل تیسرے

گودام میں۔ آج چوتھے گودام میں۔ پولیس ابھی تک کوئی خاص

بات معلوم نہیں کر سکی۔ ان حالات میں مجھے آپ کا خیال

آیا۔ میں سمجھتا ہوں۔ کوئی مجھ سے دشمنی نکال رہا ہے۔“

”معلوم تو یہی ہوتا ہے۔“ انپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”تو پھر۔ آپ اس بارے میں کچھ کہیں گے نا۔“

”ہاں! اس وقت تو میں بہت مصروف ہوں۔ کس کسی وقت آپ کی طرف آؤں گا۔ پتا لکھوا دیں۔“ انھوں نے کہا اور فاروق کو اشارہ کیا۔ اس نے پتا لکھ لیا۔ جانِ عالم نے اجازت لی اور چلا گیا۔

”ہاں دوست۔ اب تم کیا۔ ارے۔ انھیں تو نیند آرہی ہے۔“

انپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔ کیوں کہ مارے نیند کے دونوں حملہ آوروں کی گردنیں جھکی جا رہی تھیں۔

”یہ نیند کہیں مصنوعی نیند تو نہیں۔ کیا خیال ہے۔“ ٹھنڈے

پانی کے دو جگ انڈیل دوں ان پر۔“ فاروق بولا۔

”نہیں بھئی۔ بے چاروں کو نزلہ ہو جائے گا۔ پہلے ہی

سردی بہت ہے۔ ہاں تم ان کے سروں پر ایک ایک ہاتھ کیوں نہیں جما دیتے۔“ فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

”یہ ترکیب زیادہ مناسب ہے۔“ فاروق نے کہا اور اٹھ کر

ہن کی طرف بڑھا۔

”نہیں فاروق۔ اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔“ انپکٹر

جمشید عجیب سے لہجے میں بولے۔

”جی! کیا مطلب! اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ تو پھر

ضرورت کس کی رہ گئی ہے۔“

”یہ دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا چکے ہیں۔“ وہ بولے۔

”ہائیں! اتنی جلدی۔ ابھی تو ہم نے ان سے دو

ایٹیں بھی نہیں کیں۔“ محمود بولکھلا اٹھا۔

”ہاں! مجھ سے بہت غلطی ہوئی۔ دراصل میرا ذہن ان

ان الجھا ہوا تھا۔ اس لیے توجہ نہیں دے سکا۔“ انپکٹر جمشید

بولے۔

”جی۔ کیا مطلب۔ کس بات پر آپ توجہ نہیں دے

سکے۔“

”جانِ عالم پر۔ وہی ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار

گیا ہے۔“

”ارے باپ دے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”اگر یقین نہیں آتا تو اس نے جو پتا لکھوایا ہے۔ اس

فون کر کے دیکھ لو۔“

”اگر آپ کو اس بات پر یقین آ چکا ہے تو آپ اس

کے پیچھے دوڑے کیوں نہیں؟“

”اب دوڑنے کا کیا فائدہ۔ جو آدمی اس قدر صفائی سے

اپنا کام کہہ گیا۔ اس نے فرار کا بھی مکمل انتظام کر رکھا ہو

گا۔ لہذا سبھاگنا دوڑنا بے کار ہو جائے گا؟“

”اوہ! یہ عجیب ہوئی۔“ محمود بڑبڑایا۔
 ”تو تم فون نہیں کرو گے۔“ انپکٹر جمشید نے فاروق کی
 طرف دیکھا۔

فاروق نے جلدی جلدی نمبر گھمانے اور پھر مایوس
 کہ ریسپور رکھ دیا۔

”پتا غلط ثابت ہوا ہے۔“
 ”ہوں! خیر۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر انپکٹر جمشید
 اٹھے اور ان دونوں کی اچھی طرح تلاشی لی۔ پھر اکرام سے
 بولے:

”ان کے پاس سوائے پستولوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لہذا
 انھیں لے جاؤ۔ رپورٹ درج کر لو۔ جانِ عالم کا حلیہ کھنڈ
 نہ مہولنا۔“

”جی بہتر۔“
 لاشیں اٹھا لی گئیں۔ اب انھوں نے گھر میں وہ نمونہ
 سا آلہ تلاش کیا۔ جس کے ذریعے سے دونوں حملہ آور اندر
 کی باتیں سنتے رہے تھے۔ مقصدی سی کوشش کے بعد انھیں
 آلہ مل گیا۔ وہ صحن کی میز کے نیچے چپکایا گیا تھا۔

”حیرت ہے۔ یہ آلہ یہاں کس طرح چپکا دیا گیا۔ بیگم
 اس راز سے پردہ اٹھانا تمھاری ذمہ داری ہے۔“ انپکٹر جمشید

سکرائے۔

”ذمہ داری نہیں۔ اسے میری غلطی کیونکہ اندر سے بیگم
 آتی نظر آئیں۔“

”غلطی۔ کیا مطلب۔ کیا آج کا دن غلطیوں کا دن ہے۔“
 ”اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ آپ لوگوں کے آنے
 سے کچھ دیر پہلے ایک خاتون بھی اندر آئی تھی۔ وہ آپ
 سے ملاقات کرنے کی خواہش مند تھی۔ اخلاق! اسے اندر لا
 کر بٹھانا پڑا۔ میں انھیں ڈرانگ روم میں نہیں لے گئی۔
 کیوں کہ آپ لوگوں کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ یہیں صحن
 والی میز کے پاس اسے بٹھا دیا۔ اور جب آپ کے آنے کا
 وقت بتایا تو وہ گھبرا کر بولی۔ اوہو۔ تب تو ابھی کافی
 وقت ہے۔ میں پھر آ جاؤں گی اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔
 صحت ظاہر ہے۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ اور مزید ٹھہرنے
 کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ وہ روانی کے عالم میں کہتی
 چلی گئیں۔“

”ہوں! تب پھر آج کا دن غلطیوں کا نہیں۔ بے وقوفوں
 کا ہے۔“

”خیر۔ جس کا بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس قدر
 افسان میں رہے۔“

”انہیں ہمارے پروگرام کے بارے میں علم ہو چکا ہے۔ کہیں تم لوگوں کے ذریعے وہاں چوری کرانے والا ہوں۔ اب اصل آدمی کو بھی اطلاع مل چکی ہو گی۔ لہذا تم چوری نہیں کر سکو گے اور الٹا چکر میں پھنس جاؤ گے۔“
 ”گویا چوری کا پروگرام کیٹس۔“ محمود نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”یہی تو مصیبت ہے۔“ وہ بولے۔

”جی مصیبت۔ کہاں ہے مصیبت۔ مجھے تو کہیں نظر نہیں آئی۔“ فاروق گھبرا گیا۔

”مصیبت یہ ہے کہ چوری پھر بھی کرانا ہو گی۔“

”تو جم جم کرایئے۔ روکا کس نے ہے۔ ایسے نیک کام آپ کو کونسا روز روز کراتے ہیں۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔
 ”دھت تیرے کی۔ کبھی تو زبان کو روک بھی لیا کرو۔“
 ہاں آبا جان۔ آپ کیا فرما رہے تھے۔“

”یہ کہ ان تمام حالات کے باوجود تم وہاں چوری کرنے جاؤ گے۔ اور چوری کرو گے۔ بلکہ کامیاب لوٹ کر آئی بھی ضروری ہے۔ ورنہ بہت کام خراب ہو جائے گا۔“

”بات ہمارے پتے نہیں بڑی۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ چوری کہاں کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ اور

آپ کے پروگرام کی ان لوگوں کو کیسے بھٹک پڑ گئی۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ چوری کہاں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں بتا سکتا کہ کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کو ہمارے پروگرام کا علم کس طرح ہو گیا۔ یہ بات میں نہیں سمجھ سکا۔ ویسے میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔ کیوں کہ چوری کا کوئی باقاعدہ پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی اور میں نے اس پر عمل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ادھو۔ شاید یہ بات نہیں ہے۔“ وہ کہتے کہتے رک گئے۔

”جی کیا مطلب۔ کیا بات نہیں ہے۔“ فرزانہ بے تابانہ بولی۔

”انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں وہاں چوری کرنا چاہوں گا۔ بلکہ وہ تو احتیاطاً یہاں مورچے بجائے ہوئے تھے۔ کیوں کہ یہ بات ضرور انہیں معلوم ہے کہ میں ان کی آگ میں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے سوچا۔ کیوں نہ اپنے بارے میں میرا پروگرام جان لیں۔ اس طرح انہوں نے یہ کام کیا۔ اچھا غیر۔ اس بات کو چھوڑو۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے تو کیا ہوا۔ تم بہر حال وہاں چوری کرو

گئے۔ یہ لو نام اور پتا۔ اس شخص کی تجویزی میں ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا بکس ہے۔ جیسے زیورات کے بکس ہوتے ہیں۔ اس پر نمبروں والا تالا بھی لگا ہوا ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ وہ بکس اڑا لاؤ۔

”کیا آپ کو معلوم ہے۔ اس بکس میں کیا ہے؟“

”ابھی مجھ سے بکس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ یہ سوچو۔ چوری کس طرح کرو گے؟“

”شکریہ۔ کیا ہمیں یہ کام آج رات کرنا ہے۔ یا ہمیں کچھ دن کی مہلت ہے؟“

”نہیں۔ صبح سے پہلے پہلے یہ کام کرنا ہو گا۔“

”اور آپ یہاں رہیں گے؟“

”میں تم لوگوں کے ساتھ چوری کرنے تو جاؤں گا نہیں انھوں نے بڑا سا منہ بنایا۔“

”شاید آپ چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے سوالات نہ کریں۔“

”ہاں! بالکل یہی بات ہے۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔ چالاک دشمن میرے گھر میں اپنے دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر چلا گیا۔ مجھے پریشان تو ہونا ہی پڑے گا۔“

”خوشی سے پریشان ہوتے رہیے۔ ہمیں کوئی اعتراض

نہیں۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

”الیکٹرک جمشید مسکرا دیے اور وہ اپنے کمرے میں اٹھ آئے۔“

”میری ایک تجویز ہے۔“ فرزانہ نے دبی آواز میں کہا۔

”اور تجویز بتانے کے لیے آواز نیچی کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

”بھئی سمجھا کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ فرزانہ نے منہ بنایا۔

”یہ تو خیر بالکل ٹھیک ہے۔ اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی کان ہونے لگے ہیں۔ ہاں۔ وہ تم تجویز بیان فرما رہی تھیں۔“ محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہم میں سے ایک جا کر موقع کا معائنہ دن کی روشنی میں کر آئے۔“

”تجویز بری نہیں۔ لہذا جلدی ہو آؤ۔“ فاروق بولا۔

”تمہارا مطلب ہے۔ میں ہو آؤں۔“ فرزانہ نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

”چلو خیر۔ محمود ہو آتا ہے؟“

”تم نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی ہے کیا۔“ محمود نے

بھلا کر کہا۔

”اگر بڑا ماننے کی رفتار بھی ہے تو پھر میں ہی ہو آتا ہوں۔“ اس نے ہنس کر کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

محمود اور فرزانہ کھڑے پھسر کر رہ گئے۔ ایک گھنٹے بعد فاروق کی واپسی ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے:

”نہ جانے آبا جان کیا چاہتے ہیں۔ ویسے وہاں کامیاب ہونے کے امکانات بالکل نہیں ہیں۔“

”بات کیا ہے۔“ ملٹری اور پولیس کے پہرے کے بارے میں تو آبا جان پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ محمود نے منہ بنایا۔

”ہاں! لیکن بات اس سے بہت آگے نکل چکی ہے اور شاید ایسا ہمارا پروگرام سننے کے بعد ہوا ہے۔“

”اوہو! بھئی بات بتا رہے ہو یا نہیں۔“ اس کوٹھی کے چاروں طرف ملٹری اور پولیس موجود ہے۔

بات پہلے ہی ہمیں معلوم ہے۔ لیکن کس طرح موجود ہے یہ سن لو۔ کوٹھی بالکل الگ تھلگ کھڑی ہے۔ اس کے

پچاس میٹر کے فاصلے پر چاروں طرف گھاس کا میدان ہے اس گھاس کے میدان سے باہر پولیس اور ملٹری نے گھیراؤ

ہوا ہے۔ گویا کوٹھی سے گھاس کے میدان تک جگہ بالکل خالی ہے، اب کوئی پولیس اور ملٹری کی نظر سے بچ کر کوٹھی میں داخل ہو تو کس طرح۔“

”اوہ!“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”یہ تم نے نئی سنائی۔ لیکن اس کے باوجود۔ چونکہ آبا جان کا حکم ہے۔ اس لیے ہمیں چوری کرنا ہو گی۔“ فرزانہ بولی۔

”کیا بات کرتی ہو۔ ہمارے تو اندر داخل ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ چوری تو بعد کی بات ہے۔“

”میرا خیال ہے۔ اب مجھے اور محمود کو بھی جا کر جائزہ لینا ہو گا۔“

”شوق سے جاؤ۔ اور جو بات معلوم کر کے آؤ۔ مجھے بھی بتا دینا۔ میں شکر گزار ہوں گا۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

”کم از کم یہ بات ہمیں آبا جان کو بتا دینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ چوری کا پروگرام کینسل کر دیں۔“

”ایسا نظر تو نہیں آتا۔“

”بھئی بات کر لینے میں حرج کیا ہے۔“

”ہوں۔ اچھا تو پھر آؤ۔“

وہ اندر آئے۔ صحن میں ان کی والدہ بیٹھی سیڑ

بن رہی تھیں۔

”ابا جان اپنے کمرے میں ہیں کیا۔“

”نہیں۔ وہ جا چکے ہیں۔“

”جا چکے ہیں۔ لیکن کہاں۔“

”بتا کر نہیں گئے۔ صرف اتنا کہہ گئے ہیں کہ صبح سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔“

”اوہ!“ تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر وہ پریشانی کے عالم میں باہر نکلے اور اس کوٹھی کے نزدیک پہنچے۔ فاروق نے جو کچھ بتایا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ انھوں نے ایک چکر لگایا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایسے ہیں ان کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کیمرہ تھا۔ اور خفیہ انداز میں کیمرے سے اس کوٹھی کی تصاویر لے رہا تھا۔ تینوں ٹھٹھک کر رہ گئے، اور خود سے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگے۔

”یہ بھی کوئی ہمارا بھائی لگتا ہے۔“ فرزانہ بڑبڑاتی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔ اسے بھی کہیں نیلا بکس تو چوری نہیں کرنا۔ اس نے کہا۔“

”اوہ ہاں۔ شاید یہی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے۔“

ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس بکس کے چکر میں ہیں۔ معلوم نہیں۔ اس میں کیا ہے۔“

”ہوں گے کوئی فردری کاغذات۔ زیورات کے چکر میں تو ابا جان پڑ نہیں سکتے۔“

”ہوں۔ کیوں نہ ہم اس کا تعاقب کریں۔ شاید کوئی بات معلوم کر سکیں۔“ محمود نے تجویز پیش کی۔

”تعاقب تم کرو۔ گھر ہم چلے جاتے ہیں۔“ فاروق فوراً بولا۔

”بزدلوں کا اور کام کیا ہوتا ہے۔“

”بزدلی کا طعنہ مجھے غصہ نہیں دلا سکتا۔ میں جانتا ہوں۔ تم تھوٹ موٹ کا طعنہ دے رہے ہو۔ حقیقت میں مجھے بزدل خیال نہیں کرتے۔“

”خوش فہمی میں مبتلا ہو۔“

”اچھا! یہ بات ہے۔“ فاروق نے بھنٹا کر اس کے سامنے آگیا۔

”ارے ارے۔ تم لوگوں کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ہم یہاں کچھ کرنے آئے تھے اور تم لوٹنے لگے۔“ فرزانہ بری طرح گھبرا گئی۔

”اس کی ایسی کی تھی۔“ فاروق نے یہ کہتے ہی ایک مٹکا اس کے کندھے پر جڑ دیا۔ محمود نے اس پر پھلانگ لگائی۔

تو وہ بھوک کر بھاگا۔ اور اس قدر تیز بھاگا کہ محمود کو دانتوں
پسینہ آ گیا۔ وہ بھی سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

”تم دونوں کا ضرور دماغ چکر اگیا ہے۔“ فرزانہ نے تھلا کر
کہا۔ لیکن وہ بھلا اس کی کہاں شننے والے تھے۔ اچانک
فرزانہ کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھل گیا۔ فاروق اندھا
دھند دوڑتا ہوا اس کیمرے والے سے جا ٹکرایا تھا۔ دونوں
دھڑام سے گرے۔ اسی وقت محمود دوڑتے ہوئے ان کے
قریب پہنچ گیا۔ لیکن پھر ٹھوکر کھا کر کیمرے والے کے نزدیک
گم گیا۔

”ہم۔ معاف کیجیے گا جناب۔ معاف کیجیے گا۔“ فاروق
نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”معاف کیا۔ مل۔ لیکن بھئی۔ یہ کیا۔ آخر آپ کہ ہو
کیا گیا تھا۔ میں نے تو بچنے کی بہت کوشش کی تھی اور
میں آپ کی سیدھ سے ایک طرف بھی ہو گیا تھا۔ پھر
بھی آپ آخر حج سے ہی کیوں آٹکرائے۔“

”جی۔ بس۔ کیا بتاؤں۔ میرے پاؤں ٹیڑھے ہو گئے
تھے۔ جانا چاہتا تھا دوسری طرف۔ چلا آیا آپ کی طرف۔“
لیکن آپ دوڑ کیوں رہے تھے۔ وہ بھی ایسی بدحواسی

کے عالم میں؟

”میرے بڑے بھائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ پڑے تھے،
ان سے بچنا بہت ضروری تھا۔ کیوں کہ یہ ذرا زہریلے
قسم کے آدمی ہیں۔“

”کیا کہا۔ میں زہریلا آدمی ہوں۔“ محمود بھٹا کر اٹھا اور
اس کی طرف جھپٹا۔

”ارے ارے۔ میں غلط کر گیا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا
تھا۔ اور کہ کیا گیا؟“

”یہ لیجیے جناب۔ اپنا کیمرہ۔ اس سے تو میں خود ہی ہنٹ
لوں گا۔“ محمود نے یہ کہہ کر کیمرہ اس کی طرف اچھالا۔ اور فاروق
کے پیچھے دوڑ پڑا۔ فاروق نے بھی دوڑ لگا دی۔ دونوں
دوڑتے دوڑتے فرزانہ تک پہنچ گئے۔

”اب بس بھی کرو یہ ڈرامہ۔ ویسے ترکیب شان دار رہی۔
لیکن ہمیں بھلا اس فلم کی کیا ضرورت۔“ فرزانہ نے دبی آواز
میں کہا۔

”تو سکتا ہے کام آ ہی جائے۔“
”سین بھئی۔ ہمیں اس کا تعاقب بھی کرنا ہو گا۔“ فرزانہ
نے کہا۔

”وہ بھی کہہ لیتے ہیں۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔“
انھوں نے دیکھا۔ کیمرے والا اب ایک سمت میں

بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر ان کی طرف بھی دیکھ لیتا۔
اور پھر انھوں نے اسے ایک کار میں بیٹھتے دیکھا۔ جلد
ہی وہ بھی اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھ چکے تھے۔
یہ تعاقب آدھ گھنٹا تک جاری رہا۔ پھر اگلی کار ایک
چھوٹی سی کوکھی میں داخل ہو گئی۔
”میں۔ میں اندر جاؤں گا۔“ محمود نے فیصلہ کن انداز میں
کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں چوری یہاں نہیں۔ وہاں
کرنا ہے۔“ فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔
”لیکن۔ ان لوگوں کے بارے میں جاننا بھی بہت ضروری
ہے۔“
یہ کہہ کر محمود کوکھی کے پچھلی طرف بڑھ گیا۔ دونوں
بھی اس کے پیچھے چلے۔ عین اسی وقت ان کے سروں پر
قیامت ٹوٹی۔

سنہری زنجیر

ہوش آیا تو اسی جگہ پڑے تھے۔ اور سر بُری
طرح دکھ رہے تھے۔
”یہ۔ یہ کیا ہوا تھا بھئی۔“
”شاید ان لوگوں کو تعاقب کا پتا چل گیا تھا۔ لہذا
انھوں نے ہمارے سروں کا مزاج پوچھ ڈالا۔“ فاروق نے اداس
انداز میں مسکرا کر کہا۔
”لیکن ہم تو وہیں موجود ہیں۔ جب کہ ہمیں یا تو کہیں
اور ہونا چاہیے تھا یا پھر ان کی قید میں۔“ محمود برٹڑایا۔
”شاید انھوں نے یہ دونوں جھنجھٹ مول لینے کی ضرورت
محسوس نہیں کی اور یہ بہتر خیال کیا کہ وہ خود یہاں سے
چلے جائیں۔“ فرزاد نے جلدی جلدی کہا۔
”لیکن وہ اپنی کوکھی تو یہیں چھوڑ گئے ہیں۔“ فاروق کے

لجے میں حیرت تھی۔
 ”کہنئی ان کی نہیں رہی ہو گی۔ یا پھر انہیں تعاقب کا
 احساس کافی پہلے ہو گیا ہو گا اور ہمیں غیب دینے کے لیے
 اصرار آگئے ہوں گے۔“ محمود نے جواب دیا۔
 ”لیکن بھئی۔ ہم نے اس کیمرے والے کو اندر داخل ہوتے
 دیکھا تھا۔“ فاروق نے اعتراض کیا۔
 ”خیر آؤ۔ اندر چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

سروں میں شدید درد کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح
 اٹھے۔ ہاتھ پھیر کر پہلے ہی دیکھ چکے تھے، تینوں کے
 سروں پر ایک ایک چھوٹا سراور بن چکا تھا۔ گویا اب
 وہ دو سروں والے تھے۔ دروازے پر پہنچ کر انھوں نے
 گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔
 اور سفید بالوں والا ایک بوڑھا آدمی دکھائی دیا۔ ان کے
 بالوں کے نیچے دیکھ کر اس نے حیرت زدہ انداز میں ہلکیں
 جھپکائیں اور بولا:

”کیس مٹی میں کھیل کر آ رہے ہو بھئی۔“
 ”کھیلے نہیں۔ کھلائے گئے ہیں۔ وہ کیمرے والا
 کہاں ہے۔“
 ”کیمرے والا۔ کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”آپ کی کوئٹی کے کچلے حصے میں ہم تینوں پر پیچھے سے
 کسی نے حملہ کیا تھا۔ یہ دیکھیے ہمارے سر۔“
 ”لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق؟“ وہ بولا۔
 ”حملہ کرنے والا پہلے آپ کی کوئٹی میں داخل ہوا تھا۔“
 ”آج صبح سے میرے گھر میں کوئی نہیں آیا۔ اگر یقین
 نہ ہو تو میرے طرط سے پوچھ لو۔“
 ”کس سے پوچھ لیں؟“

”طرط سے، اس لیے کہ انسان جھوٹ بول سکتا ہے۔ میں
 بھی جھوٹ بول سکتا ہوں۔ لیکن میرا طوطا جھوٹ نہیں بولتا۔
 کیوں کہ اسے جھوٹ بولنے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے۔ نہ
 کوئی فائدہ۔ اسے تو روزمرہ کی چوری مل ہی جاتی ہے۔“
 وہ جلدی جلدی کر گیا۔

”آپ کچھ دلچسپ آدمی لگتے ہیں۔ چلیے، آپ کے طرط
 سے بھی دو دو باتیں کر لیں۔“

”ہاں ضرور۔ ارے۔ مگر۔ نہیں۔“ وہ چونکا۔

”کیا ہوا؟“ فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا خبر۔ تم لوگ چور وور ہو۔ اور اس بہانے میرے گھر
 کا صفایا کرنا چاہتے ہو۔“

”آپ سوئے ہوئے تو نہیں ہیں۔“ فرزانہ نے جمل کر کہا۔

ہوں خیر۔ آؤ دیکھا جائے گا۔

تینوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے
ساتھ ہی طوطے کا پیجرہ لٹکا نظر آیا۔ سبز اور سرخ رنگ کا
بڑا سا طوطا اوپر نیچے ہود رہا تھا، انھیں دیکھ کر رک
گیا اور بالکل صاف آواز میں بولا:

”خوش آمدید۔ آپ کا آنا مبارک ہو۔ کیسے۔ کیسے
تشریف لائے۔“

”چپ رہو شال۔ میں ان کے ساتھ نظر نہیں آ رہا تھیں۔
اس آدمی نے تیز آواز میں کہا۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے مالک۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ معاف
کر دیں۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”چلو معاف کیا۔ اچھا سنو۔ یہ لوگ ایک بات پوچھنا چاہتے
ہیں۔ کیا تم سچ سچ بتاؤ گے۔“

”سچ سچ کیا ہوتا ہے مالک۔“

”اچھا! یہ بتاؤ۔ جھوٹ تو نہیں بولو گے۔“

”جھوٹ تو انسان بولتے ہیں۔ طوطے نہیں۔“ اس نے کہا۔

ان کے سر شرم سے جھک گئے۔ پھر طوطے کے
مالک نے کہا:

”اچھا! یہ بتاؤ۔ آج صبح سے اس وقت تک کون کون ملاقاتی

مارے گھر آیا ہے۔“

”ہمارے گھر۔ آج۔ بس یہی تینوں حضرات آئے ہیں مالک۔
اور تو کوئی بات نہیں۔“

”سن لیا۔ آپ نے طوطے کا بیان۔“

”کیوں مالک۔ یہ کیا کہتے ہیں۔“

”ان کا کہنا ہے۔ کہ ایک کیمرے والا آدمی کچھ دیر پہلے

ہاں آیا تھا۔ اور اس نے اندر سے نکل کر ان پر حملہ
کیا تھا۔“

”ایک بات کہوں مالک۔ بڑا تو نہیں مانیں گے۔“

”بڑا کیوں ماننے لگا۔“

”میں نے ایک کار رکھنے کی آواز ضرور سنی تھی۔ لیکن

کار کوٹھی کے سامنے رک گئی تھی۔ اندر نہیں آئی تھی۔

اب اگر کوئی شخص کار سے اتر کر اندرونی دروازے تک

آیا ہو اور باہر سے باہر چلا گیا ہو تو مجھے معلوم نہیں ہو

کتا تھا۔“

”اوہ۔ اوہ۔“ اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

”وہ ان کی طرف مڑا۔“

”آپ نے کار کا ذکر نہیں کیا۔ کیا وہ شخص کار پر آیا

تھا۔“

”جی ہاں! یہ سچ ہے۔ لیکن ہوش میں آنے پر ہم نے کار دروازے پر نہیں دیکھی۔“ محمود نے کہا۔

”تب پھر طوطے کا خیال ہی درست ہے۔“ وہ مسکرایا۔
 ”سوال یہ ہے کہ کیمے والے کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ اس جگہ ہمیں اس طرح چکر دے سکتا ہے۔ یہ تو کوٹھی سے واقف ہی کوئی آدمی کر سکتا ہے۔“ محمود نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ! وہ دھک سے رہ گیا۔“

”آپ کا نام کیا ہے جناب؟“
 ”میں حمزہ میاں ہوں۔“

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ فرزانہ بولی۔
 ”میں مصنف ہوں۔“

”جی۔ کیا ہیں۔“ وہ چونکا۔

”مصنف۔ ناول اور کہانیاں رکھتا ہوں۔ اس وقت تک دس کے قریب ناول چھپ چکے ہیں، میرے اور دس کے دس نے بہت کامیابی حاصل کی ہے۔“

”اوہ۔ اوہ۔ تب تو ہمارا بھائی آپ کے بہت کام آسکتا ہے۔ اسے اپنا اسسٹنٹ رکھ لیں۔“ محمود مسکرایا۔

”کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ۔ اسے ناولوں کے نام بہت سمجھتے ہیں۔“
 ”پتا نہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک غیر مصنف آدمی کہ بھلا ناولوں کے نام کیوں کر سمجھ سکتے ہیں؟“
 ”ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ تھوک کے حساب سے سوچ سکتے ہیں۔“

”خیر۔ میں اس بحث میں نہیں پڑ سکتا۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

”ایسے نہیں جناب۔ آپ اس واقعے کو معمولی نہ سمجھیں۔ اور اپنے دوستوں کے نام بتائیں۔ ایسے دوستوں کے جن کا آپ کے ہاں آنا جانا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ حمزہ میاں زور سے چونکا۔
 ”ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ حملہ آور اس کوٹھی سے اچھی طرح واقف تھا۔ تبھی تو وہ نہایت اطمینان سے یہاں رکا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا۔ اگر اسے دیکھ بھی لیا گیا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیوں کہ وہ تو آپ کا دوست ہے۔ اور کوٹھی کی دیوار کے ساتھ وہ پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔ کیا اس طرف کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ ہے۔“

”ہاں! پچھلی طرف ایک دروازہ موجود ہے۔“

”اوہ۔ تب تو پہلے ہمیں اس طرف جانا چاہیے۔“

”ضرور چلیے۔ لیکن مہربانی فرما کر میرے دوستوں کو الجھا کی کوشش نہ کریں۔“

”چلیے۔ اگر پچھلا دروازہ اندر سے بند ملا تو نہیں کریں گے محمود نے مسکرا کر کہا۔“

”بہت بہت شکریہ۔ دروازہ کھلا ہوا ہو ہی نہیں سکتا۔“
”کیا مطلب۔ کیا آپ نے اپنے دوست کے نکل جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا تھا۔“

”آپ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بڑا مان گیا۔“

اب وہ دیوار کے ساتھ چلتے پچھلی طرف آئے، اور پھر جبروز میاں زور سے اچھلا۔ پچھلا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

”اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

”اب مجھے کم از کم اس بات کا یقین آ گیا ہے کہ کوئی کار کو دروازے پر روک کر اس طرف ضرور آیا تھا۔ اس کا پروگرام اس طرف سے نکل جانے کا تھا۔ لیکن اسے آپ روک نظر آ گئے۔ اس نے سوچا۔ آپ لوگوں سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔ کوئی چیز اس کے ہاتھ میں تھی، پس وہ اس نے آپ کے سروں پر برسا دی۔“

”ہنوں! ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا۔ لیکن بات تو ہماری ہی دیت نکلی۔ یہ کہ وہ آپ کا کوئی دوست یا واقف تھا۔“ محمود نے پُر زور انداز میں کہا۔

”یہ ضروری نہیں۔ کوٹھی دوستوں اور واقفوں کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے دیکھی ہو گی۔ مثلاً مرمت مشرت کرنے والے، بجلی کی فٹنگ کرنے والے۔ یا کسی بھی چیز کی مرمت کرنے والے۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے آپ میرے دوستوں کو پریشان نہ کریں۔“

”آپ کی بات میں بھی وزن ہے۔ لیکن جس بے تکلفی سے وہ شخص کار روک کر اندر داخل ہوا تھا۔ کوئی کاریگر یا ستری وغیرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ لوگوں کے ذہنوں میں تو بس سما گئی ایک بات۔“

”مہربانی فرما کر آپ اپنے کچھ قریبی دوستوں کے نام اور بتے لکھا دیں۔“

”میں ایسا نہیں کروں گا۔“

”اچھا۔ کم از کم اتنا بتا دیں۔ آپ کے دوستوں میں زبرد رنگ کی کار کس کے پاس پرانے ماڈل کی ٹویٹا؟

”زرد رنگ کی پرانے ماڈل کی ٹویٹا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”ہاں اجدی بتائیں“

”نہیں نہیں۔ میں نہیں بتا سکتا۔ آپ بلا وجہ انہیں تنگ کریں گے۔“

”کیا ہم یہاں سے ایک فون کر سکتے ہیں؟“

”ضرور کیوں نہیں۔ آئیے۔“ اس نے کہا اور اندر جانے کے لیے مڑا۔ اسی وقت فرزاد کے منہ سے نکلا:

”ارے! یہ کیا؟“

انہوں نے مڑ کر دیکھا تو فرزاد دروازے کے پاس سے ایک سنہری زنجیر اٹھا رہی تھی۔ اسے انگلی پر لٹکائے وہ ان کی طرف قدم اٹھانے لگی:

”جمبروز میاں صاحب۔ آپ اس زنجیر کو پہچانتے ہیں؟“

زنجیر دیکھ کر جمبروز میاں کی آنکھوں میں بلا کا خون اٹھ گیا۔ اس نے ڈری ڈری آواز میں کہا:

”یہ۔ یہ۔ یہ کہاں؟“

”تو آپ اس زنجیر کو پہچانتے ہیں؟“

”ہاں! یہ سیٹھ صدر دین کی ہے۔ وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اس پر ان کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن وہ خوردبین سے پڑھا جا سکتا تھا؟“

”ہماری بہن کسی خوردبین سے کم تو نہیں۔ چلو فرزاد

نام پڑھو۔ فاروق مکرایا۔

”اے خردوار۔ میں انسان ہوں۔ تم مجھے خوردبین بناتے دے رہے ہو۔“

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ فاروق نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

اور فرزاد اپنی تیز نظروں سے زنجیر پر لکھا نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر اس کے منہ سے انگریزی کے حروف نکلنے لگے۔ ایس اے آئی ٹی ایچ۔ سیٹھ۔ صدر دین۔

”بہت خوب۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں۔ کیا ان کے پاس نرد رنگ کی پرانے ماڈل کی ٹیولٹا بھی ہے؟“

”آپ۔ آپ لوگ میرے دوست کو پریشان نہیں کر سکتے۔“

اس نے خوں زدہ انداز میں کہا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ ہم انہیں پریشان نہیں کریں گے۔ بس

آپ ان کا پتا بتا دیں۔“

”۱۰۴ گلی خان روڈ۔ اس نے جیسے مجبوری کے عالم میں بتایا۔“

”بہتر تھا کہ آپ چند اور دوستوں کے نام پتے لکھوا دیتے؟“

”اب اس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ ان کی کار واقعی

نرد رنگ کی ہے؟“

”آؤ بھئی چلیں۔“

”اور۔ وہ آپ کسی کو فون کرنا چاہتے تھے۔“

”اب ضرورت نہیں رہی۔“

وہ اسے ہٹکا ہٹکا چھوڑ کر اسی دروازے سے باہر نکل گئے اور دوڑتے ہوئے اپنی موٹر سائیکلوں کی طرف آئے۔ چند لمحے بعد وہ گل خان روڈ کی طرف اڑے جا رہے تھے۔

”جانا تو ہمیں اس کوٹھی میں چوری کے لیے تھا۔ اور نکل کہاں آئے ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”بھئی۔ ابھی چوری کا وقت کہاں ہوا ہے۔“ محمود مسکرایا۔

”یہی۔ چوری کے بھی وقت ہونے لگے۔“ فاروق جل

کر بولا۔

”ویسے معاملہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اور

بیٹھے بٹھائے ہی شروع ہو گیا ہے۔“ فزانہ بولی۔

”خیر ہم اسے بیٹھے بٹھائے تو نہیں کر سکتے۔“ آبا جان

نے جب ہم سے یہ کہا کہ آج رات ہمیں ایک جگہ چوری

کرنا ہے تو گویا۔ معاملہ پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔

ہم اس میں بعد میں شریک کیے گئے۔“ محمود نے جلدی جلدی

کہا۔

۱۰۹ گل خان روڈ پر پہنچ کر محمود نے گھنٹی کا بٹن

دبا دیا۔ جلد ہی قدموں کی آواز سنائی دی، اور ایک

بھاری بھر کم آدمی نظر آیا:

”کیا بات ہے۔“ اس کا لہجہ اکھڑ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، اس نے پھر کہا:

”کوئی چندہ وندہ نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدم دکھاتا چلا گیا۔

”ایک تو ان چندہ مانگنے والوں نے ہمیں بہت تنگ کر

رکھا ہے۔“ جدھر دیکھو چندہ۔ گویا انہیں دن رات چندہ

مانگنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔“ فاروق نے جلتے

کٹے انداز میں کہا۔

”اب کیا کیا جائے۔“ پھر دستک دوں۔“ محمود نے ان کی

طرف دیکھا۔

”اس کے سوا کیا چارہ ہے۔“ فزانہ مسکرائی۔

محمود نے انگلی پھر بٹن پر رکھ دی۔ جلد ہی بھاری

قدموں کی آواز پھر سنائی دی۔ جونہی اس نے انہیں

دیکھا، گلا بھاڑ کر بولا:

”کیا مصیبت ہے۔“ کر جو دیا۔

”نہیں جناب۔ بالکل غلط کہ گئے تھے آپ۔ ہم چندہ

مانگنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم تو ایسے لوگوں کو

سمت ناپسند کرتے ہیں۔“

”اوہو اچھا۔ کمال ہے۔ تو پھر آپ کون ہیں اور مجھ

سے کیا چاہتے ہیں۔
 ”وہ آپ کے دوست ہیں نا۔ کیا نام ہے بھلا ان کا۔“ فرزانہ نے سرسری انداز میں کہا۔
 ”اوہ تو آپ لوگ میرے کسی دوست کا تعارفی خط لائے ہیں۔ کہ میں آپ کی مدد کروں گا۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن پہلے بات سن لیں، پھر تبصرہ کریں۔“

”اچھی بات ہے۔ سن لیتا ہوں۔ اب فرمائیے۔“ اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔
 ”آپ کے دوست حمیراز میاں ہیں۔ ہیں نا؟“
 ”خیر ہیں۔ تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟“ اس نے اٹھ لہجے میں کہا:

”اور آپ کے پاس ایک عدد زرد رنگ کی پرانے ماڈل کی ڈیوٹا کار بھی ہے۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ آپ مجھ سے پھیلیا کیوں بچھوا رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ۔ آج کا دن ہے ہی پھیلیوں کا۔“
 ”کیا مطلب؟“

”آپ کی کار کہاں ہے؟“

”ایک دوست مانگ کر لے گئے تھے۔ ابھی تک لے کر آئے نہیں۔“
 ”اوہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ محمود دھک سے رہ گیا۔“

”کیوں کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔“
 ”آپ کی کار ایک غیر قانونی کام میں استعمال ہوئی ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ اچھل پڑا۔

”یوں بات نہیں بنے گی۔ آپ فوراً ان دوست سے معلوم کریں۔ کار کہاں ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے۔ آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔“

”اوہو۔ اچھا۔“ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ پھر بولا:
 ”آئیے۔ اب آپ لوگوں کو اندر لے کر جانا ہی پڑے گا۔“
 وہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ جلدی جلدی فون کے نمبر گھاتے، پھر بولا:

”ہیلو راشد۔ تم کار لے گئے تھے۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔ کیا کہا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“
 ”اوہ۔“

اور اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ان کی طرف دیکھا، پھر ریسیدر رکھ دیا۔ چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔

بات ہو گئی۔ محمود نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نیلے۔ تم جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں۔“ صدر دین نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

”جی ڈیڈی۔“ اس نے پریشانی کے انداز میں کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

”دروازہ بند کر دیں۔“ صدر دین رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”بہت بہتر۔“ محمود نے کہا اور اٹھ کر دروازہ بند کر

دیا۔

”اس زنجیر کی کہانی حد درجے عجیب ہے۔ لیکن پہلے میں کار کے بارے میں بتاؤں گا۔ راشد میرا قریبی دوست ہے۔ دو دن پہلے اس نے کار مجھ سے لی تھی۔ ان دو دنوں میں کار اس کے پاس رہی۔ لیکن اب میں نے فون کیا ہے۔ تو اس نے بتایا کہ کار چوری ہو گئی ہے اور وہ اس کی تلاش کے سلسلے میں پریشان ہے۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔“

”اعضوں نے کیا بتایا۔ کار کب چوری ہوئی۔“

”آج صبح۔“ مجھے اس لیے اطلاع نہیں دی کہ شاید

کار مل جائے اور میں پریشانی سے بچ جاؤں۔“

”ہوں! اب آپ کے دوست راشد سے بھی ملنا پڑے گا اور

پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ بھی چیک کرنا ہو گی۔ لیکن پہلے آپ یہ بتا دیں۔ زنجیر کی کہانی کیا ہے۔“

”ہاں! زنجیر کی کہانی۔“ اس نے لمبا سانس کھینچا، ان پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

”میرے ایک مہمان ہیں۔ جالب کریم ایک ہفتے پہلے میرے

پاس آئے تھے۔ اور انھوں نے بالکل اسی طرح کمرہ بند

کرا کے یہ زنجیر مجھے دی تھی۔ ساتھ میں انھوں نے کہا

تھا۔ کہ اس زنجیر کو بہت ہی حفاظت سے رکھنا ہے۔

اس قدر حفاظت سے کہ اپنی جان کی بھی اس قدر حفاظت

نہ کرتے ہو گے۔ میں نے پوچھا، اس میں کیا خاص بات

ہے۔ تو اس نے بتایا کہ اس زنجیر کی گم شدگی سے ایک

بہت بڑا طوفان آ سکتا ہے۔ طوفان کی وضاحت اس نے

نہیں کی۔ بہر حال میں نے اسے اطمینان دلایا کہ زنجیر حفاظت

سے رہے گی اور یہ کہ اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں،

اس کے بعد میں نے اس زنجیر کو سیف کے ایک خفیہ

خانے میں رکھ دیا۔ لیکن اب یہ میں آپ لوگوں کے

پاس دیکھ رہا ہوں۔ اس سے زیادہ عجیب بات بھلا

کیا ہو گی۔“

تینوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
پھر محمود نے کہا:

”آپ ہمیں اس تجوری تک لے چلیے۔“
”ابھی تک آپ لوگوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا؛ اس نے
شک بھری نظر ان پر ڈالی۔

”اوہ۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے۔ غیر۔ ہم محمود، فاروق
اور فرزانه ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے۔ انپکٹر جمشید کے بچے۔“ اس کے
لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

”جی ہاں! بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔“

”تب تو پھر آئیے۔ اور اس پریشانی میں میری مدد
کیجیے۔ اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک منٹ بعد وہ ایک اور کمرے میں تجوری کے
سامنے کھڑے تھے۔ تجوری بند تھی۔ اس پر دوسرے قفل
لگے ہوئے تھے۔ نمبروں والا اور چابی والا۔ تجوری تھی بھی
جدید قسم کی۔

”زنخیر میں نے اس میں رکھی تھی۔“
”اسے کھولیں۔“ فاروق نے بے چینی کے عالم میں

کہا۔

اس نے پہلے نمبر ملائے پھر چابی گھمائی۔ چابی اس نے
جیب سے نکالی تھی۔ دروازہ کھلنے کے بعد اندر ایک
خفیہ خانہ نظر آیا۔ اس میں دو قفل تھے۔ اس نے دوسری
جیب سے چابی نکالی اور اس کا تالا بھی کھول ڈالا۔
”ارے۔ یہ کیا۔ زنخیر تو واقعی غائب ہے۔“ فرزانه
بول اٹھی۔

”اسی خیال سے تو میں بے ہوش ہوا تھا۔ کہ آخر
یہ زنخیر آپ کے ہاتھ میں کس طرح پہنچ گئی۔ پھر جب
کہانی سنی تو اور بھی حیرت ہوئی۔ اب آپ لوگ بتائیں۔
یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔“

”آپ کام کیا کرتے ہیں۔“ محمود نے پوچھا۔
”اس موقع پر یہ سوال کہاں سے ٹپک پڑا۔“ اس کے

لہجے میں حیرت تھی۔

”پہلے آپ سوال کا جواب دیں۔“ محمود مسکرایا۔

”میں وزیر خارجہ کا سیکرٹری ہوں۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔ پھر محمود نے جلدی سے

کہا:

”اور آپ کو زنخیر آپ کے کسی دوست نے نہیں۔ وزیر

خارجہ نے دی تھی۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا۔“

”میں نے ان کے لیے لفظ دوست تو بولا بھی نہیں تھا، یہ کہا تھا کہ میرے ایک مہمان نے میرے حوالے کی تھی۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ زنجیر مجھے وزیر خارجہ نے دی تھی۔“

”اب آپ کے بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ آپ کی اس تجویز سے کون کون اچھی طرح واقف ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ تجویز کے تالے کے نمبر کس کس کو معلوم ہیں۔“

”یہ تجویز صرت سرکاری کاموں کے لیے ہے۔ اس لیے میں نے اس کے نمبروں کے بارے میں کسی کو نہیں بت رکھا۔ تب تو معاملہ بہت عجیب ہے۔ کوئی زنجیر کیسے لے اڑا۔ اس طرح کہ آپ کہ کانوں کان خبر تک نہیں ہو سکی۔“ فرزانہ بولی۔

”مارے حیرت کے میرا برا حال ہے۔“ اس نے کہا۔
”آئیے۔ ہمیں آپ کے دوست راشد کو چیک کرنا ہو گا۔“

”یہ۔ یہ کام اس کا بھی نہیں ہو سکتا۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔ ہمارا نہیں۔“ فرزانہ نے مزہ

بنایا۔

”خیر چلیے۔“ اس نے کندھے اچکا دیئے۔

صدر دین کی کار میں بیٹھ کر وہ ایک ماڈرن آبادی میں پہنچے۔ ایک بڑی سی کوشی کے دروازے پر رک کر دستک دی گئی۔ ایک پٹھان چوکیدار نے دروازہ کھولا:
”راشد صاحب کی کار ٹھیک ہو گئی۔“ محمود نے اچانک کہا۔

فاروق، فرزانہ اور صدر دین نے اسے گھورا۔ ادھر چوکیدار نے حیران ہو کر کہا۔
”کیا مطلب۔ کون سی کار، ان کی کار تو بالکل ٹھیک ہے۔“ چوکیدار بولا۔

”شکریہ۔ مہربانی فرما کہ ہماری آمد کی انہیں خبر دو۔“ صدر دین صاحب کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔
”بہت اچھی طرح جناب۔“ اندر تشریف لائیے۔

انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ چلا گیا۔ جلد ہی قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر جو آدمی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑی طرح اچھلے۔ یہ وہی تھا۔ کیمرے والا۔

چند لمحے حیرت اور سکتے کے عالم میں گزر گئے۔
پھر محمود نے قریباً چلا کر کہا:

مسٹر صدر دین۔ وہ یہی تو صاحب ہیں۔ جن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم جمہور میاں کی کوٹھی تک گئے تھے۔ پھر یہ کار وہاں روک کر اندر گھس گئے۔ ہم نے کوٹھی کے اندر داخل ہونے کے بارے میں سوچا اور پچھلے حصے کی طرف گئے تو ہمارے سروں پر کوئی وزنی چیز دے ماری تھی اور ہم بے ہوش ہو گئے۔ اور اب خاص بات بھی سن لیں۔ یہی صاحب کیمبرہ لیے وزیر خارجہ غالب کیم کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر گھوم پھر رہے تھے۔ اور مختلف سمتوں سے کوٹھی کی تصاویر لے رہے تھے۔

یہ۔ یہ میں کیسا سن رہا ہوں ارشد۔ مجھے اپنے کانوں پر ابھی تک یقین نہیں آ سکا۔

اور یقین آنا بھی نہیں چاہیے میرے دوست۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کار تو صبح سویرے کسی نے چرا لی تھی اور میں صبح ہی اس کی چوری کی رپورٹ درج کرا چکا ہوں۔ اگر یقین نہیں تو چل کر پولیس اسٹیشن سے تصدیق کر لیتے ہیں۔ کیا میں اتنا ہی پاگل ہوں کہ ایک طرف تو کار کی گم شدگی کی رپورٹ درج کراؤں

اور دوسری طرف اس کار میں گھومتا پھروں۔ اس نے جھٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

آپ نے مسٹر صدر دین سے کار کیوں مانگی تھی۔ جب کہ آپ کے پاس اپنی کار ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ وہ لیراج میں کار دیکھ چکے تھے۔

"مم۔ میری کار۔ چند روز سے تنگ کر رہی تھی۔ صدر دین کے پاس دو کاریں ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے مانگ لی۔"

آپ نے اپنی کار مرمت کیوں نہیں کرائی؟ محمود بولا۔

"یہی پروگرام تھا۔ کہ اپنی کار ورکشاپ میں کھڑی کر دوں گا اور صدر دین کی کار سے کام چلاتا رہوں گا۔ لیکن وہ صبح سویرے گھر کے سامنے سے غائب ملی۔ میں نے اس کو ولے ہی کھڑا کر دیا تھا۔ آپ لوگ دیکھ ہی سکتے ہیں۔ اندر دو کاروں کے کھڑا کرنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کسی نے کار چرائی، اور پھر آپ کے میک آپ میں اس کار کو لیے پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم نے اس کا تعاقب بھی کیا۔"

"میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، سوائے اس کے کہ کار چوری ہو گئی تھی۔ اور بس۔"

”اچھا مٹر راشد! ذرا اس کو دیکھیے۔“ یہ کہہ کر محمود نے جیب سے زنجیر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ وہ اس نے صدر دین کے حوالے نہیں کی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیوں! آپ اس کو نہیں پہچانتے۔“

”بالکل نہیں۔ میں اس زنجیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے پُر زور لہجے میں کہا۔

”صدر دین صاحب۔ صورتِ حال بہت عجیب ہے۔ اگر یہ کام مٹر راشد کا نہیں تو پھر آپ کی تجوری کون کھول سکتا تھا۔ کیوں کہ تجوری کو باقاعدہ کھولا گیا ہے۔ اس کے تالے توڑے نہیں گئے۔“

”م۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری تو عقل دنگ ہے۔“

صدر دین نے بوکھلا کر کہا۔

”اب ہمیں آپ کی تجوری پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھوانا ہوں گے۔ متعلقہ پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کو چیک کرنا پڑے گا۔ ہماری آپ سے درخواست ہے۔ تجوری کو چھوا نہ جائے۔“

”بہت بہتر! ویلے میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ کام ارشد کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”تب پھر آپ کی تجوری۔ تجوری۔ تجوری۔“ فزانہ اٹھنے لگی۔

”بس! اب تجوری سے اگلا لفظ نہیں نکلیے گا۔“ فاروق نے بھٹکا کر کہا۔

”کیا ہوا فزانہ۔“ محمود نے جلدی سے کہا۔

”یہ آپ نے تجوری کس فرم سے خریدی تھی اور کب؟“

”تجوری تو چھ ماہ پہلے خریدی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ پہلی تجوری بہت پرانی ہو گئی تھی اور اس کے تالے بھی خراب ہو گئے تھے۔ جب کہ دفتر کی طرف ہدایات یہ تھیں کہ سرکاری کاغذات کے لیے خاص تجوری دفتر کے خرچ سے خرید لی جائے۔“

”ہوں! اب تجوری بنانے والی فرم سے بھی بات کرنا ہو گی۔ اس کو بنانے والے کاری گر کے لیے تجوری کھول لینا کوئی مشکل کام نہیں ہو سکتا۔“

”کیا!!!“ صدر دین اور راشد کے منہ سے نکلا۔

”خیر آپ فکر نہ کریں۔ تجوری کی رسید لینے کے لیے ہم آپ کے پاس آئیں گے۔ اس دوران تجوری پر سے نشانات اٹھوالیں گے۔ اب ہمیں اجازت دیں۔ اور ہاں آپ کی کار کہیں مل جائے تو ضرور اطلاع دیجیے گا۔“

اچھی بات ہے۔ صدر دین نے فرما کہا۔

وہ باہر نکل آئے۔ کمرے سے نکلے وقت فرزانہ نے راشد کی طرف دیکھا۔ تو وہ بہت بنا بیٹھا نظر آیا۔

کیا خیال ہے بھئی۔ باہر نکل کر محمود بولا۔

کسی خیال کا یہاں کیا کام۔ بس بے خیال ہی چلتے رہتے

ہیں۔ فاروق مسکرایا۔

”کیا مطلب ہے؟“ فرزانہ نے اسے گھورا۔

”بھئی جب معاملات کسی کروٹ نہ بیٹھیں۔ کوئی بات

سمجھ میں نہ آ سکے تو پھر خیالات وغیرہ کے چکر میں نہیں

پڑنا چاہیے۔ بس آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ حالات خود بخود

کسی نہ کسی کروٹ بیٹھتے چلے جائیں گے۔“

کسی حد تک بات ٹھیک ہے، لیکن اس کا یہ مطلب

بھی نہیں کہ ہم بالکل نہ سوچیں سمجھیں۔ فرزانہ نے سر ہلایا۔

”خیر۔ تمھاری مرضی۔ سوچو۔“

مجھے تو یہ شخص راشد بالکل فرار لگتا ہے۔ ہم نے اسی

کا تعاقب کیا تھا، اسی نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ کوئی

واقعہ آدمی ہی حمبروز میاں کی کوٹھی میں داخل ہو سکتا تھا۔

اور پچھلے دروازے سے نکل کر ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ اب

چوں کہ سیٹھ صدر دین حمبروز میاں کا دوست ہے، اور

راشد بھی سیٹھ صدر دین کا دوست ہے، اس لیے راشد ضرور

حمبروز میاں کے ہاں بھی آتا جاتا ہو گا۔ ویسے ہم کیوں

اس بات کی تصدیق حمبروز میاں سے کر لیں۔“ محمود کہتا

چلا گیا۔

”ضرور کیوں نہیں۔“ فرزانہ بولی۔

محمود نے ایک پبلک فون بومٹھ سے فون کیا۔

”اسٹیشن پر حمبروز میاں کی آواز سنائی دی۔“

”ہیلو حمبروز میاں صاحب۔ کیا آپ راشد کو جانتے ہیں؟“

”راشد۔ کون راشد؟“

”صدر دین صاحب کا دوست ہے۔ ہم نے سوچا۔“

”آپ بھی اسے جانتے ہوں؟“

”نہیں! میں کسی راشد کو نہیں جانتا اور نہ کبھی سیٹھ صدر

نے اپنے کسی راشد نامی دوست کا ذکر مجھ سے کیا۔“

اس نام کا کوئی آدمی ان کے ساتھ کبھی میرے پاس

نہیں۔“

”اوہ! اچھا۔ شکریہ۔ بس یہی معلوم کرنا تھا۔“ اس

حیرت زدہ انداز میں کہا۔

”لیکن بات کیا ہے؟“

”جس شخص کا ہم نے تعاقب کیا تھا۔ اور وہ کار

آپ کے دروازے پر روک کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس کا نام راشد ہے۔ اور سیٹھ صدر دین کا کہنا ہے کہ وہ ان کا دوست ہے۔ ان کی کار بھی اسی نے لی ہوئی تھی۔

”تب تو آپ لوگوں کا کام بن گیا۔ اس کے خلاف رپورٹ درج کرا دیں۔“ جمہوز میاں نے کہا۔

”ابھی مکمل کام نہیں بنا اور ہم کچا کام کرنے کے عادی نہیں ہیں نا۔ اچھا شکریہ۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔

”جمہوز میاں کسی راشد کو نہیں جانتے۔ اب یہ خیال ہے۔“

”پھر وہی خیال۔“ فاروق بڑبڑایا۔

”تب پھر اب تجوری کی طرف توجہ دیتے ہیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”اور ادھر چوری کا وقت ہو رہا ہے۔“ محمود

کہا۔

”غالباً آبا جان نے یہ نہیں کہا تھا کہ کس وقت چوری ہو۔“

”بس یہ کہا تھا کہ آج رات چوری کرنی ہے۔“ فرزانہ

بولی۔

”اور رات شروع ہو چکی ہے۔“ فاروق منہایا۔

”میں انکل اکرام کو فون کرتا ہوں۔ ادھر وہ صدر دین کی کوٹھی

تک پہنچیں گے، ادھر ہم۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم پہلے

چوری کریں گے اور ان کے نکلنے کے بعد تجوری بنانے والی

فرم کو چیک کریں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“

اکرام کے ساتھ انہوں نے تجوری کو چیک کیا، لیکن

اس پر صرف صدر دین کی انگلیوں کے نشانات مل سکے۔

اور کسی کے نہیں تھے۔ صاف ظاہر ہے۔ زنجیر کا چور

اپنے نشانات مٹا چکا تھا۔ وہ اکرام کے ساتھ باہر

آئے۔ ایسے میں فرزانہ بولی:

”انکل آپ جالب کریم کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔“

”وہ تو وزیر خارجہ ہیں۔“

”جی ہاں! لیکن آج کل ان کی کوٹھی کے گرد فوج اور

پلیس کیوں موجود ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ انیکل صاحب کو شاید یہ بات معلوم

ہو۔“

”اگر کوئی جالب کریم صاحب کے ہاں چوری کا پروگرام بنائے

آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔“ محمود

بولاً۔

”کیا بات کہتے ہیں۔ وہاں تو پرندہ پر نہیں جا سکتا۔“
”ہوں۔ تو آپ ہمیں کچھ نہیں بتا سکتے۔“

”اب مجھے کیا معلوم۔ آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“
اس نے منہ بنا کر کہا۔

”یہی تو مشکل ہے انکل۔“ فاروق مسکرایا۔
”کیا مشکل ہے۔“

”ہم خود بھی نہیں جانتے۔ کہ ہم کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہ ایک اور رہی۔ میرا خیال ہے۔ مجھے تو آپ لوگ اجازت ہی دے دیں۔“
”ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔“

اکرام چلا گیا۔ اور انھوں نے جالب کریم کی کوٹھی کی راہ لی۔ نزدیک پہنچ کر انھیں فوج اور پولیس اسی طرح چوکس نظر آئی۔

آخر۔ یہاں ہماری دال کس طرح گٹکے گی۔“ فاروق بڑبڑایا۔
”ہماری نہ لکھی تو شاید کسی اور کی گل جائے۔“

بولاً۔

”کیا مطلب۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

”کیمرے والے۔ یعنی راشد کو نہ بھروسہ۔ اس کا مطلب ہے۔“
”کچھ اور لوگ بھی کوٹھی میں چوری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ورنہ تصویریں اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔ خیر۔ میں اس وقت فرزانه کی عقل کو آواز دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ فرزانه کی عقل۔ تم کہاں ہو۔“ فاروق نے منہ اٹھا کر قدرے بلند آواز میں کہا اور چاروں طرف دیکھا بھی۔

”میری عقل میرے پاس ہی ہے۔ وہ تمھاری عقل کی طرح آوارہ گرد نہیں ہے۔“ مجھے تم۔“ فرزانه جل گئی۔

”ہاں! سمجھ گیا۔ یہ کہ ایک بار پھر تم جلتے بھننے کا ریکارڈ لڑنے والی ہو۔“ فاروق مسکرایا۔

”جلتی ہے میری جوتی۔“ اس نے پاؤں پٹختے۔

”وہ بے چاری اب کیا جلے گی۔ جل جل کر لاکھ پہلے ہو چکی ہے۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”تم دونوں چوری کا پروگرام غارت کر کے رہو گے۔“
”اوہ تمللا اٹھا۔“

”وہ کیسے۔ کیا میں نے فرزانه کی عقل کو آواز دے کر عقل کی ہے۔“ فاروق اس کی طرف مڑا۔

”نہیں۔ لیکن اپنی عقل کو آواز فرزانه تم سے کہیں بہتر

دے سکتی ہے اور پھر اس کی عقل آواز بھی تو اسی کی پہچانتی ہے۔ تمھاری آواز تو فقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو گی۔ لہذا خاموش رہو اور اسے غور کرنے دو۔

ہاں اور کیا۔ فرزانہ جلدی سے بولی۔

خیر! میں یہ بات مانے لیتا ہوں۔ لیکن اتنا سن لو فرزانہ۔

آج کا دن تمھاری عقل کی ناکامی کا دن ہے۔

یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکا

ہم کوٹھی کا چاروں طرف سے جائزہ لے چکے ہیں۔ کوٹھی

میں داخل ہونے کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ لیکن ایسے ٹیڑھے

مسئلے ہمارے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں۔ اس لیے۔

میری مانو اور ایک کام کرو۔

ایک کیا۔ ہم تو تمھاری دس ماننے کے لیے تیار ہیں

محمود نے فوراً کہا۔

ہم کی بجائے۔ صرف میں کا لفظ استعمال کرو تو بہتر ہوگا

فاروق نے مشورہ دیا۔

سب سے پہلے ہمیں جو کام کرنا چاہیے تھا۔ کیا ہے

نہیں۔ فرزانہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

کیا مطلب۔ سب سے پہلے ہمیں کیا کرنا ہے

تھا۔ محمود بولا۔

میک آپ۔ ہم اپنی اصلی شکل صورت میں یہ کام نہیں کر سکتے۔

ہوں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اب ہم میک آپ کرنے کے لیے

گھر تو جانے سے رہے۔ لہذا ریڈی میڈ میک آپ کر

لیتے ہیں۔ محمود نے تجویز پیش کی۔

ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں، اس سے بھی کام چل جائے گا۔

انہوں نے جلدی جلدی میک آپ کیا۔ خود کو آئینے

میں دیکھا اور پھر محمود نے کہا۔

ہاں فرزانہ۔ اب بناؤ۔ کیا کرنا ہے؟

پہلے تو سیدھے چلے چلتے ہیں۔ ذرا دیکھیں۔ تو سہی۔

لوچ اور پولیس کیا کہتی ہے؟

کھسے گی کیا۔ صرف اتنا کہ دے گی۔ آپ لوگ اندر

میں جا سکتے۔

اس پر ہم بھی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ فرزانہ مسکرائی۔

کیا مطلب؟ محمود اور فاروق دونوں نے چونک کر فرزانہ

کی طرف دیکھا۔

آؤ۔ تم نہیں سمجھو گے۔ اس لیے کہ عقلیں واقعی گھر

بہر آئے ہو۔

”چلو بھئی۔ اب اس کی عقل کا سہارا لینا ہو گا۔ فاروق نے منہ بنایا۔

تینوں پر سکون انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ آخر فوج اور پولیس نے یہ بات محسوس کر لی کہ وہ کوشی کی طرف ہی بڑھ رہے ہیں:

”خبردار۔ آگے آنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”چوروں کے لیے۔“ فرزانہ نے فوراً کہا اور آگے بڑھنا جاری رکھا۔

”وک جاؤ لڑکی۔ ہمیں یہ ہدایت ہے کہ خبردار کرنے کے باوجود جو آگے بڑھے، اسے گولی مار دی جائے۔“ ایک فوجی آفیسر نے گرج دار آواز میں کہا۔

”تو سپر۔ ماری کیوں نہیں۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”ابھی تو خبردار کیا ہے۔ گولی مارنے کا مرحلہ تو اب آئے گا۔“ فوجی غزایا۔

”ہمیں مسٹر جالب کریم سے ملنا ہے۔“

”افسوس! آج کے دن وہ کسی سے بھی نہیں مل سکیں گے۔“

”لیکن کیوں۔ ایسی کیا بات ہے۔“

”جو بات بھی ہے۔ بتائی نہیں جا سکتی۔ اور سچ تو

یہ ہے کہ ہمیں بھی معلوم نہیں۔“

”اوہو۔ اچھا۔ کمال ہے۔“ فاروق نے حیرت ظاہر کی۔

”پیغام اندر پہنچانے کی بھی اجازت ہے یا نہیں۔“

”ہاں! ہم پیغام اندر بھیج سکتے ہیں۔ کیا تحریری پیغام ہے۔“

”جی ہاں! آج کل زبانی پیغامات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ فاروق نے کہا۔

فرزانہ نے کاغذ قلم سنبھالا اور جلدی سے ایک جملہ اس پر لکھ کر فوجی انصر کی طرف بڑھا دیا۔ اسے بھی بہت حیرت ہوئی۔

”بس! اتنا سا پیغام۔“

”جب اس پیغام کو مسٹر جالب کریم پڑھیں گے۔ اس

وقت آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ کتنا بڑا پیغام ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں یہ اندر بھیجا دیتا ہوں۔ تم لوگ

یہاں سے دس قدم دور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ تاکہ ہم پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔“ آفیسر نے کہا۔

”مزدور جناب۔ کیوں نہیں۔“ فرزانہ مسکرائی اور تینوں پیچھے

ہٹ آئے۔

”تم نے کیا لکھ کر بھیجا ہے فرزانہ۔“

”بس دیکھتے جاؤ۔ وہ شوح انداز میں بولا۔

”دیکھتے کس طرح جائیں۔ دفعہ تو اندر جا چکا ہے۔“ فاروق

نے منہ بنایا۔

”مارے بے چینی کے میرا بڑا حال ہے۔ اور اگر جالب کریم نے ہمیں اندر بلا لیا تو اس حیرت میں اور اضافہ ہو جائے گا، لیکن اس وقت تمہارے پاس بتانے کا وقت نہیں رہ جائے گا، اس لیے فرزانہ۔ بتا ہی دو۔ تم نے کیا لکھا ہے۔“

”صرف یہ لکھا ہے کہ جس چیز کی حفاظت کے لیے اتنا کچھ کیا گیا ہے۔ وہ تو یہاں سے پہلے ہی غائب کر دی گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ دونوں اچھل پڑے۔

”جب تمہارا یہ حال ہوا ہے۔ تو جالب کریم کا کیا ہو

گا۔“ فرزانہ ہنسی۔

”ہم تو سمجھ رہے تھے۔ تم نے عقل بیچ کھائی ہے۔ یا باورچی خانے میں بھول آئی ہو۔ لیکن یہ خیال تو غلط ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔“ محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”چلو شکر ہے۔ تمہاری غلط فہمی تو دور ہوئی۔“

”لیکن فرزانہ! تم یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کر

سکتی ہو۔“

”یہ تو سمجھ لو۔ میں نے اندھیرے میں ایک تیر چلایا ہے۔ اب اگر وہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا تو اس میں میرا کیا قصور۔ اس نے شرما کر کہا۔

”یار فاروق۔ آج تو یہ ہمارے کان مکمل طور پر کترینے کی تیاری کر رہی ہے۔“ محمود نے منہ بنا کر کہا۔

”اے خبردار۔ میں کوئی چوہیا ہوں۔“ فرزانہ بھڑک اٹھی۔

”ہاں سبھی واقعی۔ کم از کم تم اسے چوہیا نہیں کر سکتے۔“ فاروق نے فوراً کہا۔

”جیو فاروق۔“ فرزانہ نے اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔

”ہائیں ہائیں۔ یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ اور میں نے تمہیں چوہیا کیسے کہا۔“

”کہا ہے یا نہیں۔ جملے کا مطلب یہی۔ ارے۔ وہ

دیکھو۔“ آفیسر ہمیں بلا رہا ہے۔“ فرزانہ اپنا جملہ بھول گئی۔

”تینوں تیزی سے آگے بڑھے۔ جونہی نزدیک پہنچے۔

فرجی آفیسر کی آواز گونجی،

”انہیں گرفتار کر لیا جائے۔“

وہ چیز

”بھئی واہ فرزانہ۔ تمہاری ترکیب واقعی کارگر رہی۔ اب ہم بہت شان و شوکت سے کوٹھی کے اندر داخل ہوں گے۔“ فاروق نے جلی کر کہا۔

”بس دیکھتے جاؤ۔ ضرور ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ بیکر کہ فرزانہ نے فوجی آفیسر سے کہا:

”آپ ہمیں کس خوشی میں گرفتار کر رہے ہیں، ہمارا جرم؟“
”جواب کریم صاحب بتائیں گے۔“ اس نے مزہ بن کر کہا۔

”فورا ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ انھوں نے بھی نہایت سکون سے پہن لیں اور کمر بھی کیا کتے تھے۔ اب انھیں اندر کی طرف لے جایا جانے لگا۔ کوٹھی کے گیٹ کے دائیں بائیں۔ وسیع اور سرسبز باغ تھا۔ درمیان والی سڑک کافی دور تک جاتے نظر آئی۔ وہ اس پر چلتے رہے۔ یہاں

تک کہ اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ ایک کمرے میں انھیں بٹھا دیا گیا۔ وہاں ایک اور فوجی آفیسر موجود تھا۔ آنکھوں پر لینک تھی۔ سینک میں سے انھیں گھورتے ہوئے اس نے کہا:

”تم تینوں کے نام؟“

”محمود، فاروق اور فرزانہ؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولا۔

”ان میں سے کس نام کا مطلب پوچھ رہے ہیں آپ۔ یا تینوں ناموں کا مطلب نہیں آتا۔“

”غاموش۔ جو پوچھا جائے۔ بس اس کا جواب دو۔ یہ نام ایک مشہور و معروف انپکٹر جمشید کے بچوں کے ہیں۔“
”کیا یہ نام اور بچوں کے نہیں ہو سکتے۔“ محمود نے مزہ بنایا۔

”ہاں! ہو سکتے ہیں۔ بالکل ہو سکتے ہیں۔ خیر۔ تم نے نذر پر جو جملہ لکھ کر دیا تھا۔ اس کا مطلب جانتے ہو؟“
”ہاں! جانتے ہیں۔ اسی لیے تو لکھ کر دیا تھا۔“
”بتاؤ۔ کیا مطلب تھا۔“

”مطلب ہم صرف جواب کریم صاحب کو بتا سکتے ہیں۔“
”اچھی بات ہے۔ ایک دو منٹ بعد تمہیں ان کے سامنے

پیش کیا جانے والا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اس فوجی آفیسر کی طرف دڑا
جو انھیں یہاں تک لایا تھا:

”کیا ان کی تلاشی لی جا چکی ہے؟“

”نہیں سر۔ اس کی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔“

”تم۔ تم اعمق ہو۔ اگر یہ کوئی خطرناک چیز اندر لے جانے
میں کامیاب ہو جاتے۔“ اس نے گرج کر کہا۔

”اوہ۔ معاف کیجیے گا سر۔ ابھی ملتے ہیں۔“ یہ کہہ کر
اس نے اپنے تین ماتحتوں کو اشارہ دیا۔ انھوں نے جلدی جلا
تلاشی لی۔ اور جیبوں کی چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ ان
چیزوں میں وہ زنجیر بھی تھی۔ عینک والے فوجی آفیسر نے
ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر بولی:

”نہیں۔ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ اے۔ اپنی چیزیں
اٹھا لو۔“

”شکریہ جناب۔“ وہ بولے اور اپنی چیزیں اٹھا کر جیب میں
رکھ لیں۔ اس سے کم از کم ایک بات واضح ہو گئی تھی۔
یہ کہ ان لوگوں کو واقعی اس زنجیر کے بارے میں کچھ معلوم
نہیں تھا۔ لیکن جالب کریم تو ضرور جانتے تھے۔ اسی وقت
اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پولیس انکپٹر کا چہرہ نظر
آیا:

”دقت والے تینوں حضرات کو اندر بھیج دیا جائے۔“
”او کے سر۔“

ان کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ وہ اس کمرے میں
داخل ہوئے اور پھر ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں
اندر ان کے والد انکپٹر جمشید سمی موجود تھے۔ انھوں نے
بڑی مشکل سے اپنے چہروں کو حیرت کے اثرات سے بچایا۔
اور پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک بڑی اور شاہانہ سی کرسی
پر ایک بارعب آدمی بیٹھتے تھے۔ باقی لوگ ان کے دائیں
بائیں کرسیوں پر موجود تھے۔ یہ یقیناً جالب کریم تھے۔
”تو یہ ہیں وہ لوگ۔ کیوں بھیجی۔ تم نے کیا لکھ کر
بھیجا تھا۔“

”یہ کہ۔ جس چیز کی حفاظت کے لیے اس قدر انتظامات
کیے گئے ہیں۔ وہ چیز تو یہاں سے پہلے ہی ہٹا دی گئی
ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”ہوں۔ اور تم نے یہ بات کس طرح لکھ دی۔ تم کیا
جانو۔ وہ کیا چیز ہے۔ اور تمھیں یہ بات کس طرح معلوم
ہے کہ اس چیز کو یہاں سے ہٹا دیا گیا ہے؟“
”بس کسی طرح لکھ ہی سکتے تھے۔ اور لکھ گئے۔“ محمود
نے کہا۔

”صاف صاف بات کرو۔ ورنہ جیل میں نظر آؤ گے۔“ جالب کریم نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔ جس کی حفاظت کے لیے اس قدر انتظامات کیے گئے ہیں۔“ فرزانہ نے قد سے نرم آواز میں کہا۔

”نہیں۔ میں نہیں بتا سکتا۔“

”تو پھر۔ کیا آپ اس بات کو پسند کریں گے کہ ہم اس چیز کے بارے میں سب کے سامنے بتا دیں۔“

”تم کچھ بتا ہی نہیں سکتے۔“

”آپ پہلے یہ فرض کر لیں کہ ہم بتا سکتے ہیں اور پھر یہ بتائیں۔ سب کے سامنے ہمیں بتانے کی اجازت ہے۔“ محمود نے باوقار لہجے میں کہا۔

”نہیں۔ وہ ہکلائے۔“

”تب پھر۔ آپ دو کام کریں۔ ایک تو یہ کہ اس جگہ کا جائزہ لے لیں۔ اور اگر وہ چیز وہاں نہیں ہے تو پھر سب لوگوں کو یہاں سے ہٹا دیں۔ ہم آپ کو اس چیز کے بارے میں بتا دیں گے۔“

”مجھے ان کی تجویز سے اتفاق نہیں سر۔“ انپکڑ جمشید بول

اٹھے۔

”کیا مطلب؟“ جالب کریم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور دوسری طرف محمود، فاروق اور فرزانہ بھی حیران رہ گئے، انہیں ہرگز امید نہیں تھی کہ ان کے والد بھی ان کی مخالفت کریں گے، جب کہ وہ ان کے حکم پر ہی یہاں آئے تھے۔ انہوں نے سنا، وہ جالب کریم سے کرا رہے تھے:

”دیکھیے جناب عالی۔ آپ نے میری ڈیوٹی صرف اس لیے لگوائی ہے کہ میں آپ کی کونٹھی میں چوری نہ ہونے دوں۔ یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں؟“

”اس میں بھلا کیا شک ہے۔“ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔
”شک ہے! اب یہ لوگ جس پُر اسرار انداز میں آپ تک پہنچے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں۔“
”ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”لہذا میں ان پر شک کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ضرور یہ کسی پکر میں ہیں۔ ان کی یہ تجویز بہت خون ناک ہے۔ کہ آپ پہلے سیف کھول کر دیکھ لیں کہ وہ چیز وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اس طرح یہ آپ کو سیف کھولتے ہوئے دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ وہ چیز دراصل کہاں رکھی ہے۔ اور اس کے بعد یہ اس چیز پر ہاتھ صاف کر دیں گے۔“

”آپ کے ہوتے ہوئے۔“ جالب کریم کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مجھ سے بہت زیادہ چالاک لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں، ہم ایسا وقت ہی کیوں آنے دیں۔ آپ ان کے سامنے تجویز ہرگز نہ کھولیں، البتہ خود تنہائی میں مزور دیکھ لیں۔“

”بات معقول ہے۔ ان کے سامنے کھولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ جالب کریم جلدی سے بولے۔

”بالکل جناب عالی! ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ محمود نے خوش ہو کر کہا۔

”اچھا تو پھر آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔“ انھوں نے کہا اور تیز تیز قدم چلتے کمرے سے نکل گئے۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف دیکھا۔ تینوں فوراً ان کی نظروں کا مطلب سمجھنا لگے۔ لہذا دم سادھے کھڑے رہے۔ ویسے یہ ان کی زندگی کے عجیب ترین سے لمحات تھے۔

دو منٹ بعد جالب کریم اندر داخل ہوئے۔

”وہ چیز اپنی جگہ موجود ہے۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔“

”ہاں بالکل! ارے مگر۔ ان لوگوں کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی۔“

”اب ہمیں ان کی کہانی سن لینی چاہیے۔ آخر یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔“ جالب کریم نے جل کر کہا۔

”چلیے یونہی سہی۔ تم لوگوں کی کہانی کیا ہے۔“ انسپکٹر

جمشید اجنبی انداز میں بولے۔

”بتا دیتے ہیں۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟“ محمود نے بے فکر ہو کر کہا۔

”تو بتاؤ نا۔“ وہ بولے۔

”ہمارا گزر چند گھنٹے پہلے اس طرف سے ہوا تھا۔ ہم نے ایک شخص کو کچھ فاصلے پر دیکھا۔ اس کے پاس ایک عدد کیمرا تھا اور وہ اس کیمرے سے کوٹھی کی تصاویر لے رہا تھا۔ دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ کوٹھی کے اندر گرد فوج اور پولیس کا زبردست پہرہ موجود ہے۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ بات سچی بھی حیرت کی۔ لہذا ہم نے اس کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ یہ کوٹھی ملک کے ایک اہم وزیر کی ہے۔ اور اس کی نگرانی کرنے والا ملک کا دشمن بھی ہو سکتا تھا۔ ہم اس کے تعاقب میں نکل گئے۔“ محمود یہاں تک کہ کہ سانس لینے کے لیے رکا۔

”بہت خوب! جالب کریم کی حیرت میں ڈوبی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔“

”تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ شخص اپنی کار ایک کوٹھی کے سامنے روک کر خود اس کے اندر چلا گیا۔ ہم بھی اپنی اپنی گاڑی سے اتر کر اس کوٹھی کا جائزہ لینے لگے۔ آخر

فیصلہ یہ کیا کر اندر داخل ہونا چاہیے۔ تاکہ دیکھیں تو سہی۔
 کیا چکر ہے۔ ابھی ہم کوٹھی کے پچھلے حصے کا جائزہ لے
 رہے تھے کہ ہمارے سروں پر اچانک کوئی وزنی چیز ماری
 گئی۔ ہم بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو اس شخص
 کی کار غائب تھی۔ ہم نے کوٹھی کے دروازے پر دستک
 دی۔ کوٹھی کے مالک سے ہماری ملاقات ہوئی۔ اس کا نام
 جمروز میاں ہے۔ ہم نے ساری بات بتا کر اس سے پوچھا کہ
 وہ کون شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص کوٹھی
 کے اندر داخل نہیں ہوا۔ نہ اس نے کسی کو دیکھا۔ البتہ
 یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اندر داخل ہو کر کوٹھی کی دیوار
 کے ساتھ ساتھ چلتا پچھلے دروازے پر پہنچ گیا ہو۔ اور وہاں
 سے نکل کر اس نے حمل کیا ہو۔ ہم نے پچھلے دروازے کا
 معائنہ کیا۔ تو ہمیں وہاں سے ایک چیز ملی۔ اس چیز کو
 دیکھ کر کوٹھی کا مالک جمروز میاں بھی حیران رہ گیا۔ اس نے
 بتایا کہ وہ چیز تو اس نے ایک دوست کے پاس دیکھی
 تھی۔ ہم نے اس دوست کا نام پوچھا۔ تو اس نے اپنے
 دوست کا نام صدر دین بتایا۔ کار کا رنگ پوچھا تو صدر
 دین صاحب کے پاس اس رنگ کی کار ہونے کی بھی تصدیق
 کی۔

”کیا! وزیر خارجہ صاحب زور سے چلائے۔ انپکڑ جمشید کی
 آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔“

”خیر تو ہے جناب۔ آپ کی آنکھوں میں خوف موجود ہے۔“

”ہاں! ایک منٹ۔ آگے بتاؤ بھئی۔ پھر کیا ہوا۔“

”ہم صدر دین صاحب سے ملے۔ پہلے انھیں ساری بات

بتائی۔ پھر انھیں وہ چیز دکھائی اور ان سے پوچھا۔ آپ کی

یہ چیز آخر وہاں کیوں پائی گئی ہے۔ اس پر انھوں نے

ایک اور حیرت انگیز کہانی سنائی۔ کیا ہمیں وہ کہانی سنانے

کی بھی اجازت ہے۔“

”ضرور کیوں نہیں۔ اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے۔“

”صدر دین کا بیان ہے کہ ان کی کار ان کا ایک دوست

راشد لے گیا تھا۔ اور وہ چیز جو جمروز میاں کی کوٹھی کے

پچھلے دروازے پر ملی۔ وہ انھوں نے اپنے سیف میں رکھی

ہوئی تھی۔ جب انھوں نے سیف کو کھول کر دیکھا تو وہ چیز

غائب تھی۔ اب ان کے دوست راشد سے معلوم کیا گیا۔ اس

نے بتایا کہ کار چوری ہو گئی ہے اور یہ کہ اس نے اس کی

چوری کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ رپورٹ چیک کی گئی۔

اس کا بیان درست تھا۔ یہ ہے کل کہانی۔“

”یہ کل کہانی کس طرح ہو گئی۔ اور اگر یہ کل کہانی ہے

تو پھر تم لوگ یہاں کس طرح پہنچ گئے۔ انپکٹر جمشید نے انہیں گھورا۔

تینوں مسکرائے، پھر محمود نے کہا،

”آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ کمافی کا صرت ایک ننھا سا ٹھکڑا ہم نے بیان نہیں کیا، اگر اجازت ہو تو وہ بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جالب کریم کی طرف دیکھا۔
”ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔“ جالب کریم بولے۔

”تو پھر سنئے۔ مسٹر صدر دین کا بیان ہے کہ آپ ان کے پاس گئے تھے۔ اور وہ چیز انہیں دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کو نہایت حفاظت سے رکھا جائے۔ کیوں کہ بہت اہم ہے۔“

”اُن مالک۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔“ جالب کریم نے قریباً چلا کر کہا۔

اب حیران ہونے کی ان کی باری تھی۔ کیوں کہ جالب کریم کے چہرے پر حیرت کے آثار مصنوعی نہیں تھے۔ بالکل اصلی تھے۔

نیا جھٹکا

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جناب۔“ انپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

”میں صدر دین کے پاس نہیں گیا، نہ کوئی چیز اس کے ہوالے کی۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔“

”کیا مسٹر صدر دین آپ کے دوست بھی نہیں ہیں۔“

”وہ میرے دوست ضرور ہیں۔ لیکن بھلا میں کوئی اہم چیز ان کے پاس کیوں رکھو اتا۔ جب کہ میرے گھر میں سرکاری سطح پر تیار کرائے گئے بہت خاص قسم کے سیف موجود ہیں۔“

”اور ان خاص قسم کے سیفوں کے ہوتے ہوئے آپ کی وہ چیز غائب ہے۔ جس کی حفاظت کے لیے اس قدر انتظامات کیے گئے ہیں۔“ محمود کے لہجے میں طنز تھا۔

”یہ بات بھی درست ہے۔ خیر۔ سب سے پہلے تو میں یہ جاننا

چاہوں گا کہ وہ چیز ہے کیا۔ جس کے بارے میں صدر دین کا یہ بیان ہے کہ میں نے وہ اس کے حوالے کی ہے۔
 ”اب وہ چیز دکھا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ آپ نے تو ان کے حوالے کوئی چیز کی ہی نہیں۔ محمود نے کہا اور جیب سے زنجیر نکال کر ان کے سامنے لہرا دی۔

”صدر دین بہت بڑا جھوٹا ہے اور اسے اس جھوٹ کی سزا دی جائے گی۔ میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔“
 یہ کہہ کر وہ فون کرنے لگے۔ جلد ہی سلسلہ مل گیا تو انھوں نے کہا :

”جیلو صدر دین۔ جانب کمریم بات کر رہا ہوں۔ حیرانی فرما کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ یہ کہہ کر انھوں نے ریسورٹر کو دیا اور پھر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ ایک فوجی آفیسر اندر داخل ہوا :

”لیس سر۔“

”ایک صاحب صدر دین نامی آنے والے ہیں۔ انھیں میرے پاس لے آیا جائے۔“

”کیا ان حالات میں یہ مناسب رہے گا سر۔“ فوجی آفیسر نے پریشان ہو کر کہا۔

”وہ میرے قریبی دوست ہیں۔ ان سے کوئی خطرہ نہیں۔“

”او کے سر۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

اب انھیں انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ آخر انتظار ختم ہوا۔ اور صدر دین کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے قدرے حیرت زدہ انداز میں سب کو دیکھا اور بولے :

”خیر تو ہے۔“

”صدر دین۔ یہ تم آج کل کیا ہوائیاں چھوڑ رہے ہو۔“

”جی۔ کیا مطلب؟“

”تم میرے دوست ضرور ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے بارے میں غلط باتیں کرنا شروع کر دو۔“

”میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔“

”کیا تم نے انھیں نہیں بتایا کہ۔ میں نے ایک اہم چیز حفاظت کی غرض سے تمہارے پاس رکھوائی ہے۔“

”تو پھر۔ اس میں کیا غلط بات ہے۔ یہ تو بالکل سچ ہے۔“ صدر دین نے منہ بنایا۔

”کیا کہا۔ یہ بالکل سچ ہے۔“ جانب کمریم چلائے۔

”ہاں! ایک ہفتہ پہلے آپ میرے گھر آئے تھے۔ اور وہ زنجیر میرے حوالے کی تھی۔ تاکہ میں اسے اپنے سیف میں رکھ لوں۔“

”میں نے اس سے بڑا جھوٹ آج تک نہیں سنا۔“

افسوس! آپ مجھے جھوٹا کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم بہت اچھے دوست ہیں۔

”میں ان دو ہفتوں کے دوران ایک بار بھی تمہارے گھر نہیں گیا۔ اور نہ یہ زنجیر میں نے تمہیں دی۔ نہ ہی یہ زنجیر میری ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو میرے پاس تو اپنا ایک منٹ کا حساب موجود ہوتا ہے۔ دو ہفتے کی ڈائری دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اس میں میرا تمہارے ہاں جانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا، وہ میری۔“ انھوں نے جذباتی آواز میں کہا اور میز کی دراز سے ڈائری نکال کر ان کی طرف اچھال دی۔ ڈائری انپکڑ جھشید نے دبوچی۔ اور جلدی جلدی اس کی ورق گردانی کرنے لگے، آخر انھوں نے کہا:

”اس سے تو یہی ثابت ہے کہ آپ مشر صدر دین سے نہیں ملے۔“

”نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ صدر دین کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ پھر انھوں نے بھی ڈائری لے کر دیکھی۔ ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

”تب پھر۔ وہ۔ وہ کون تھا۔“ ان کے منہ سے ڈرے ڈرے انداز میں نکلا۔ پھر وہ تڑ سے گمے اور ساکت ہو گئے۔

”ارے۔ ارے۔ یہ کیا بھئی۔“ جالب کریم گھبرا گئے۔

انپکڑ جھشید بھی ان پر جھک پڑے۔ محمود، فاروق اور رزانہ بھی الگ کھڑے نہ رہ سکے۔ جوشی وہ سب ان پر بھکے۔ انھیں ایک زور دار چمک آیا۔ اور پھر وہ لمبے لمبے چلے گئے۔ پندرہ منٹ بعد انھیں ہوش آیا۔ تو صدر دین کمرے میں نہیں تھا:

”مارے گئے۔ بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ۔ انپکڑ جھشید چلائے۔“

”نہیں!“ جالب کریم لڑ گئے۔ پھر وہ اندر کی طرف دوڑے۔

”یہ۔ یہ کیا ہوا۔“ فرزانہ ہکلائی۔

”سب تمہاری وجہ سے ہوا۔“ انپکڑ جھشید نے بھٹا کر کہا۔

”جی کیا فرمایا۔ ہماری وجہ سے۔ لیکن ہم نے کیا کیا ہے۔“

”تم نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ بس ہم سب جال میں آ گئے۔“ دشمن کا جال حیرت انگیز تھا۔

”تت۔ تو کیا۔ وہ اہم چیز اڑانی جا چکی ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔“

اسی وقت جالب کریم اندر داخل ہوئے، ان کا چہرہ دودھ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

”وہ۔ وہ ہاتھ صاف کر گیا۔ میں صدر دین کو نہیں
چھوڑوں گا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے گھنٹی کا
بٹن دبایا۔

”کیا کر رہے ہیں۔ یہ کام ان کا نہیں ہے۔“ انپکٹر
جمشید جلدی سے بولے۔

اسی وقت فوجی آفیسر اندر داخل ہوا:

”صدر دین کس وقت یہاں سے گئے ہیں۔“
”جی ابھی کوئی پانچ منٹ پہلے۔ لیکن آپ یہ بات کیوں
پوچھ رہے ہیں۔ آپ کے کمرے سے ہی تو نکل کر گئے
ہیں۔“

”ہاں! ہم اس وقت بے ہوش تھے۔ وہ ہاتھ صاف کر
گیا۔“

”کیا!!!“ فوجی آفیسر چلا اٹھا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا:
”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ان حالات میں کسی کو
نہیں بلانا چاہیے۔“

”ہاں! آپ کا خیال ٹھیک تھا۔ غلطی میری ہے۔“

”لیکن۔ وہ تو آپ کے دوست تھے۔“

”انپکٹر جمشید کا خیال ہے کہ دوست کے میک آپ میں کوئی
اور یہاں آیا تھا اور ایسا باقاعدہ منصوبہ بندی سے کیا گیا ہے،

م ابھی اور اسی وقت صدر دین کے ہاں جا رہے ہیں۔ آپ
رگ بھی ایک گاڑی میں ساتھ چلیے۔

”او کے سر۔ یہ تو بہت حیرت کی بات ہو گئی۔“

”بہت سے ممی دو ہاتھ آگے۔“ فاروق بولا۔

فوجی آفیسر نے اسے تیز نظروں سے گھورا، پھر بولا:

”میرے خیال میں تو یہ لوگ بھی اس کے ساتھی ہیں۔“

”ہاں! انہیں حراست میں لے لیا جائے۔“

”نہیں جناب، اس کی ضرورت نہیں۔ یہ مجرموں کے ساتھی ہرگز
نہیں ہیں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”کیا مطلب؟“

”یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ اور دراصل میری ہدایت کے
مطابق یہاں آئے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ مجرم اس
حد تک منصوبہ بنا چکے ہیں کہ ہم ہی ان کے کام آجائیں
گے۔“

”یہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔“ جناب کہیم بڑبڑائے۔

”خود میرا بہت بُرا حال ہے۔ لیکن میں وہ چیز ان سے

ضرور حاصل کروں گا۔ آپ بس یہ بتا دیں کہ وہ کیا چیز ہے۔“

”ہمارے ملک کا ملک شین سے ایک عدد دفاعی معاہدہ

ہوا تھا۔ یہ دفاعی معاہدہ حد درجے خفیہ ہے۔ اس کی تفصیلات

کا علم صرف چند اوپر کے لوگوں کو ہے۔ لیکن ہمارا دشمن ملک شاربستان اس معاہدے کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اور جب سے معاہدہ ہوا ہے، اس وقت سے اس کوشش میں تھا۔ انہوں نے کہنا۔ وہ آج کامیاب ہو گیا۔

”کاش آپ نے یہ بات مجھے پہلے بتا دی ہوتی۔ اس صورت میں میں انہیں کامیاب نہ ہونے دیتا۔“

”کیا مطلب۔ اس صورت میں آپ کیا کرتے۔ اس وقت بھی تو آپ یہاں موجود تھے۔ اور آپ کی موجودگی میں مجرم اس معاہدے کی فائل کو لے اڑے۔“

”ہاں! لیکن فائل آپ نے رکھی تھی۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ مجرم اس کمرے سے سیف والے کمرے میں گیا اور سیف سے اس نے فائل حاصل کر لی۔ آخر کیسے۔ اس نے سیف کس طرح کھول لی۔“

”شعاع کے ذریعے۔ سیف پگھلی پڑی ہے۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔“

”اگر مجھے تمام حالات پہلے ہی بتا دیے جاتے۔ تو میں فائل کا کوئی اور انتظام کرتا۔ لیکن آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ اور میں بت سکتا بھی نہیں تھا۔ یہی طے ہوا تھا ہم لوگوں کے درمیان۔ انہوں نے بڑا سا منہ بنایا۔

”آئیے۔ سب پہلے صدر دین کے گھر چلیں۔ ضرور وہاں بھی کوئی چکر چلایا گیا ہے۔ آنے والا کم از کم آپ کا دوست نہیں تھا۔ انہوں نے کہا۔“

وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہوئے اور صدر دین کے گھر پہنچے۔ وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ اور صدر دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ گھنٹی کا بٹن دبایا گیا، لیکن کوئی نہ نکلا، آخر وہ خود اندر داخل ہوئے۔ گھر کے تمام افراد ایک کمرے میں بند پائے گئے۔ انہیں جلدی جلدی کھولا گیا۔ ان میں صدر دین بھی تھے۔ بالکل اسی جیسے کے شکل و صورت اور آواز بھی مختلف نہیں تھی۔

”شکر ہے مالک۔ اس مصیبت سے نجات ملی۔ چوبیس گھنٹہ ہو گئے ہیں ہمیں بندھے ہوئے۔“ انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

”ہمیں بہت انہوں ہے صدر دین۔ ہم بہت بڑے جال میں پھنس گئے تھے۔ بس کیا بتائیں۔“

سب کو کھول دیا گیا۔ وہ بے چارے اپنے ہاتھ پیر ہلانے لگے۔ ان کے جسموں پر رسیوں کے نشانات بہت گہرے تھے، اور نیل پڑ گئے تھے۔

”آخر یہ کیسے ہوا؟“ الیکٹرک جھنڈ بولے۔

”اب سے چوبیس گھنٹے پہلے دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بس۔ کئی حملہ آور مجھ پر ٹوٹ پڑے، پھر انھوں نے گھر کے افراد کو بھی باندھ دیا۔ اس کے بعد کیا ہوتا رہا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔“

”ہوں۔ اس معاملے کی اب پوری طرح ہی جانچ پڑتال کرنا ہو گی۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”لیکن اب کیا فائدہ۔ فائل تو ہاتھ سے نکل چکی ہے۔“

وہ تو پہلی فرصت میں اس کی فلم بنا لیں گے اور اگر ہم ان سے فائل واپس حاصل کر بھی لیں۔ تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ غالب کریم نے پریشان انداز میں کہا۔

”اس صورت میں ہم ملک شین سے نیا معاہدہ کریں گے“ انپکٹر جمشید بولے۔

”بہر حال! میں صدر محترم کو رپورٹ کرنے پر مجبور ہوں۔ اتنی بڑی خبر کو اپنے ملک نہیں رکھ سکتا۔“

”آپ ضرور ایسا کریں۔“ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

اور وہ ان سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ دوسرے دن کے اخبارات میں معاہدے کی فائل کی چوری کی خبروں سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ اور ان اخبارات نے انپکٹر جمشید پانڈے کی شان دار ناکامی کو خوب اچھالا تھا۔ وہ یہ خبریں پڑھ کر

جیلان ہو رہے تھے۔ کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو خان رحمان نظر آئے :

”اس شان دار ناکامی پر مبارک باد دینے آیا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”شکریہ انکل! یہ شاندار ناکامی آپ کو بھی مبارک ہو۔“

”ہوں! یہ چکر کیا ہے؟“ انھوں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”آبا جان ہی کچھ بتا سکیں گے۔“ محمود نے کندھے اُچکا دیے۔

وہ بھی ان کے ساتھ صحن میں بیٹھ گئے۔

”شہر میں بہت مذاق اڑ رہا ہے جمشید۔“ خان رحمان بولے۔

”اچھا۔ کمال ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”اور ایک اہم بات یہ کہ فوجی آفیسرز کی میٹنگ ہو رہی ہے۔“

”ہے۔ اس فائل کی چوری ایک نازک مسئلہ ہے۔ خفیہ معاہدے کے بارے میں اب دشمن ملک کو معلوم ہو گیا ہے۔“ خان رحمان نے

مرد آہ بھری۔

اسی وقت پھر گھنٹی بجی۔ انداز پر دفسر داؤد کا

تھا :

”جاؤ بھئی۔ ایک اور مبارک باد قبول کرو۔“ انپکٹر جمشید

نے مسکرا کر کہا۔

جلد ہی پروفیسر داؤد بھی ان کے درمیان بیٹھے تھے۔
 واقعہ تو پتا نہیں کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ محمود، فاروق
 اور فرزانہ وہاں میک آپ میں کیوں گئے تھے۔
 ”میری بے وقوفی کی وجہ سے۔“ انپکڑ جشید نے منہ بنایا۔
 ”کیا مطلب۔ بے وقوفی اور تمھاری یہ تم کیا کہہ رہے
 ہو جشید۔“ پروفیسر داؤد کے لہجے میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔
 ”کیوں پروفیسر صاحب۔ کیا مجھ سے بے وقوفی سر نہ نہیں ہو
 سکتی۔ کیا میں انسان نہیں ہوں۔“

پپ۔ پتا نہیں۔ وہ بوکھلا کر بولے۔

”جی کیا فرمایا۔ پتا نہیں۔ یعنی آپ کو معلوم نہیں کہ
 میں انسان ہوں۔“

”ہاں! میرے خیال میں تو تم کوئی اور ہی چیز ہو۔ جو کام
 اب تک تم انجام دے چکے ہو۔ وہ۔“

”بس پروفیسر صاحب۔ اپنا جملہ یہیں تک رہنے دیں۔ انسانوں
 نے تو نہ جانے کتنے بڑے بڑے کام کر ڈالے ہیں۔“
 ”اچھا خیر۔ اس بات کو جانے دو۔ یہ بتاؤ۔ یہ سب کیا
 چکر ہے۔ کیسے ہوا۔ دشمن تمھارے ہوتے ہوئے کس طرح
 کامیاب ہو گئے۔“

”ان کا منصوبہ بہت زبردست تھا۔ اور بہت زیادہ سوچ

کچھ کہ ترتیب دیا گیا تھا۔“

”ہم تفصیلات جاننا چاہتے ہیں، اخبارات سے تمام باتیں واضح
 نہیں ہو سکیں۔“ خان رحمان بے چین تھے۔

”اچھی بات ہے۔ عرض کرتا ہوں، ہمارے حکمے کو اپنے ایک
 ایجنٹ کے ذریعے۔ یعنی دشمن ملک میں موجود آدمی کے ذریعے
 یہ اطلاع ملی کہ حال ہی میں ہمارے ملک کا ملک شین سے
 ایک معاہدہ ہوا ہے۔ جس کو بہت خفیہ رکھا گیا ہے۔ شارجان
 اس معاہدے کی فائل اڑانے کی تیاری کر چکا ہے۔ ہوشیار ہو جائیں
 ہم نے یہ اطلاع فوری طور پر صدر صاحب کو دی، انھوں نے

مجھے ہدایات دیں کہ اس معاملے کو میں خود دیکھوں اور یہ کہ اس سلسلے
 میں وزیر خارجہ جالب کریم صاحب سے مل لوں۔ کیوں کہ اصل فائل
 ان کے پاس ہے۔ میں تو ان کی طرف دوڑا گیا۔ خبر سن
 کر وہ دھک سے رہ گئے اور بولے۔ پپر۔ اب کیا کیا جائے،
 میں نے ان سے کہا کہ میں سب انتظام کر لوں گا۔ بس آپ
 یہ بتا دیں کہ فائل کہاں رکھی ہے۔ مجھے وہ جگہ دکھا دیں۔
 اس پر انھوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگے۔ فائل میرے
 پاس کوٹھی میں ہی ہے۔ وہ بہت محفوظ سیٹ میں ہے۔ وہ
 سیٹ میں آپ کو نہیں دکھا سکتا۔ بس آپ حفاظت کے انتظام
 کریں۔ میں انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ جالب کریم صاحب کی

بات مجھے پسند آئی تھی۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو کہ فائل کہاں رکھی ہے۔ رات کے وقت میں نے خود وہاں ڈیوٹی دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان حالات میں مجھے ایک خیال آیا۔ یہ کہ کیسوں نہ محمود، فاروق اور فرزاد کے ذریعے وہاں چوری کرا کے دیکھا جائے۔ اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو دشمن بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے ان سے کہا کہ انھیں ایک گھر میں چوری کرنا ہے۔ لیکن میں نے انھیں فائل کے بارے میں نہیں بتایا۔ چوری تو کرنا تھی ہی نہیں۔ بس یہ دیکھنا تھا کہ کوئی اندر تک پہنچنے میں تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ اندر داخل ہونے کے ارادے سے پہلے وہاں کا جائزہ لینے چلے گئے۔ اس وقت انھوں نے کوٹھی کے آس پاس ایک کمرے والے کو دیکھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ وہ بھی ان کی طرح شاید کوٹھی میں چوری کرنا چاہتا ہے اور جائزہ لے رہا ہے کہ کس طرف سے اندر داخل ہو۔ انھوں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ ایک کمار میں تھا۔ یہ موٹر سائیکلوں پر۔ تعاقب ایک کوٹھی تک جاری رہا۔ کوٹھی کے دروازے پر کمار روک کر وہ شخص اندر چلا گیا۔ انھوں نے اندر داخل ہونے کا پروگرام بنایا۔ اس غرض سے یہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف گئے۔ جیسا کہ ان کی عادت ہے، وہاں ان کے سروں پر کوئی

دونی چیز ماری گئی۔ یہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو کوٹھی کے دروازے سے کار غائب تھی۔ انھوں نے گھنٹی بجائی تو کوٹھی کا مالک جمبروز میاں باہر آیا۔ یہ اس کے ساتھ اندر آ گئے اور ساری بات اسے بتائی۔ انھوں نے کوٹھی کے پچھلے دروازے کا جائزہ لیا تو وہاں ایک زنجیر پڑی تھی۔ زنجیر انھوں نے اٹھالی۔ کاد کا نمبر انھیں یاد تھا۔ جب انھوں نے وہ نمبر جمبروز میاں کو بتایا تو اس نے کہا کہ اس نمبر کی کار تو سیٹھ صدر دین کی ہے۔ یہ فوراً سیٹھ صدر دین کے ہاں پہنچے، اس نے اقرار کیا کہ اس نمبر کی کار ان کی ہے۔ لیکن کار ان کے دوست راشد نے لے رکھی ہے۔ راشد سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ کار چوری ہو گئی ہے۔ اور اس نے رپورٹ درج کرا دی ہے۔ انھوں نے صدر دین کو وہ زنجیر دکھائی تو صدر دین صاحب خوت زدہ ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ زنجیر تو انھوں نے سیٹ میں بہت حفاظت سے رکھی تھی۔ اور یہ کہ زنجیر ان کی نہیں۔ وزیر خارجہ جالب کویم صاحب کی ہے۔ انھوں نے ان کے پاس رکھوائی تھی جب انھوں نے سیٹ کو کھول کر دیکھا تو زنجیر وہاں نہیں تھی۔ ان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور ادھر چوری کا وقت ہو چلا تھا۔ لہذا انھوں نے پہلے واردات کرنے کی کھائی۔ میک آپ کیا اور

کو کھٹی تک آ گئے۔ اندر داخل ہونے کا اور تو کوئی طریقہ نظر نہ آیا، ایک رقعہ لکھ کر اندر بھیج دیا کہ جس چیز کی حفاظت کے لیے یہ سارا چکر چلایا گیا ہے۔ وہ چیز تو پہلے ہی یہاں موجود نہیں ہے۔ جملہ عجیب تھا۔ میں اندر ہی تھا۔ جالب کریم اس کو پڑھ کر بہت حیران ہوئے۔ اور انھیں اندر بلانے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے صدر دین والی بات دہرائی تو وہ اکھڑ گئے اور کہا کہ انھوں نے صدر دین کے پاس کوئی ذخیرہ نہیں رکھوائی۔ پھر صدر دین کو بلوانے کا پروگرام بنا۔ فوج آفیسر نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور کہا کہ ان حالات میں کسی کو بھی بلانا مناسب نہیں ہے۔ کوئی غلط آدمی بھی آ سکتا ہے۔ لیکن جالب کریم نے کہا کہ صدر دین ان کے بہت اچھے دوست ہیں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح صدر دین صاحب دیاں آ گئے۔ ذخیرہ کی بات چیت ہوئی۔ جالب کریم نے زور شور سے یہ بات کہی کہ انھوں نے کوئی ذخیرہ انھیں نہیں دی، یہ بالکل غلط ہے۔ اور صدر دین کا اصرار تھا کہ انھوں نے ذخیرہ دی ہے۔ اسی دوران ایک بہت ہلکا سا دھماکا ہوا۔ کوئی زہریلا بم پھٹا تھا۔ اور ہم بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو صدر دین صاحب غائب تھے۔ سیف کو دیکھا گیا تو وہ بھی شجاع کے ذریعے پکھلا دیا گیا تھا اور اس میں سے

لاٹ غائب تھی۔ ہم فوراً صدر دین کے پاس پہنچے۔ تو صدر دین اور ان کے گھر کے افراد ایک کمرے میں بندھے ہوئے تھے، گویا وہ کوئی نقلی صدر دین تھا۔ جس نے محمود، فاروق اور فرزاد سے ملاقات کی تھی اور بہت دیر پہلے وہ اس گھر پر قبضہ کر چکا تھا۔ ”یہاں تک کہ کمرہ انپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔“

”بہت پڑا سارا واقعات ہیں۔ اب ذرا ان کا تجزیہ ہو جائے۔“ پروفیسر دادو بولے۔

”ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ اس معاملے میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ صدر دین کے دوست راشد کا کردار بھی پڑا سارا ہے۔ اسے کار مانگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ارے ہاں۔ یہ بات تو ہم سمجھ ہی گئے۔ ہم نے اہل صدر دین سے یہ نہیں پوچھا کہ انھوں نے اپنی کار اپنے دوست راشد کو دی تھی یا نہیں۔“ انپکٹر جمشید چونک کر بولے اور پھر جلدی جلدی صدر دین کے نمبر ملانے لگے، سلسلہ ملنے پر بولے :

”ہیلو صدر دین صاحب۔ انپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ ایک بات تو رہ ہی گئی۔ آپ نے اپنے دوست کو کار دی تھی۔“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ میری کار غائب ضرور ہے۔“

”اوہ! وہ بولے۔“ اچھی بات ہے۔ ہم اس معاملے کو بھی دیکھتے ہیں۔ انھوں نے ریسور رکھ دیا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ راشد کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ اس نے کار صدر دین سے نہیں مانگی تھی۔ جبکہ نقلی صدر دین نے یہی کہا تھا۔ گویا راشد بھی اس کا ساتھی ہے۔ یا پھر۔“ وہ کہتے کہتے روک گئے۔

”یا پھر۔ کیا۔“ فرزانہ بولی۔

”یا پھر وہ بھی نقلی تھا۔ اصل راشد اور اس کے گھر والے بھی بندھے پڑے ہوں گے۔“

”اوہ۔ اوہ۔ اگر بات یہی نکلی تو ان کا تو اب تک نکل گیا ہو گا کچھ مر۔“

وہ تیز رفتاری سے راشد کے گھر پہنچے۔ دروازے کھلے ملے اور گھر کے افراد ایک کمرے میں بندھے بے ہوش پڑے تھے۔ ان کی حالت بہت نازک تھی۔ انھیں بہت رنج محسوس ہوا۔ یہ خیال تو انھیں کل ہی آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جمشید۔“ خان رحمان لہجن کے عالم میں بولے۔

”ہاں کمر۔“

”فرض کرو۔ تم ان تینوں کی ڈیوٹی پوری کرنے کی نہ لگاتے۔ پھر دشمنوں کا منصوبہ کس طرح پورا ہوتا۔“

”خان رحمان۔ تم نے بہت اچھا سوال کیا۔ لیکن شاید تم نے واقعات کو نہایت غور سے نہیں سنا جیسا کہ جاسوسی معاملات میں ضرورت ہوتی ہے اس بات کی کہ معمولی سے معمولی بات پر بھی پوری توجہ دی جائے۔ کیوں کہ بعض اوقات بلکہ۔“

اکثر اوقات معمولی باتیں ہی تھیں پہنچاتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مجرم ان معمولی باتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہاں تو اس سلسلے میں تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ انھوں نے ایک کیمرے والے کو دیکھا تھا۔ جو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر رہ کر تصاویر لے رہا تھا۔ انھوں نے اسے دیکھ لیا اور تعاقب شروع کر دیا۔ شاید اس نے بھی انھیں نہ صرف دیکھ لیا تھا، بلکہ پہچان بھی لیا تھا۔ لہذا اس نے سوچا کہ چلو ان سے ہی کام لے لیا جائے۔ ورنہ یہ لوگ وہاں نہ جاتے تو کوٹھی کی نگرانی کرنے والا کوئی شخص تو اس کی طرف توجہ دیتا اور تعاقب کرتا۔ وہ

حضرت کار اور زنجیر کہیں بھی۔ یا پھر جہروز میاں کے گھر میں چھوڑ کر فرار ہو جانے۔ تعاقب کرنے والے اس کے ذریعے ضرور صدر دین تک جاتے۔ وہاں نقلی صدر دین اس سے ملاقات کرتا۔ اور وہی کچھ کہتا جو ان سے کہا۔ اب ظاہر ہے۔ نگرانی کرنے والا فوراً جا کر یہ بات جالب کریم کو بتاتا۔ اس کے بعد زنجیر کی بات بھی آتی۔ اور جالب کریم فوراً صدر دین کو بلا لیتے اور یہ واردات بالکل اسی طرح انجام پاتی۔

اب بات سمجھ میں آ گئی۔ مطلب یہ ہوا کہ دشمنوں کا منصوبہ پوری طرح مکمل تھا۔

”ہاں! وہ بولے۔“

”پھر۔ اب تم نے کیا سوچا ہے۔ فائل تو اب گئی ہاتھ سے۔ وہ تو شارجہستان پہنچ بھی گئی ہو گی۔“

”ہاں! اس کا افسوس زندگی بھر رہے گا۔ لیکن میں اس منصوبے کے مجرم کو ضرور گرفتار کروں گا۔ اسے سزا ضرور دلاؤں گا۔“ انھوں نے کہا پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کی طوط مڑے۔

”کیرے والے کا حلیہ کیا تھا۔“

”اس کا قد لمبا تھا اور وہ بہت دبلا پتلا سا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ انپکٹر جمشید کے لیے میں حیرت در آئی۔

”کیوں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“

”تم اس شخص کو بھول گئے۔ جو گفتگو سننے والوں کا ساتھی تھا۔ اور انھیں ختم کرنے ہمارے گھر آیا تھا۔“

”اوہ۔ ہاں! اس کا حلیہ بھی تو یہی تھا۔“

”اس کا مطلب ہے۔ ہمیں اس لیے آدمی کو تلاش کرنا ہو گا۔ محمود۔ اکرام کو فون کرو۔“

میں منٹ بعد اکرام وہاں موجود تھا:

”ہمیں ایک بہت لمبے اور بہت دیلے پتلے آدمی کی تلاش ہے۔ کیا اس حلیے کا آدمی تمھاری یادداشت کے ذخیرے میں ہے؟“ انپکٹر جمشید نے اس سے کہا۔

اکرام سوچ میں ڈوب گیا، پھر سر اٹھا کر کہا:

”نہیں سر۔ اس قسم کے آدمی سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن میں نے اس قسم کا ایک آدمی ایک ہوٹل میں ضرور دیکھا ہے۔“

”بہت خوب اس سے اچھی بات سمجھایا گیا ہو سکتی ہے۔“

”ہوٹل کا نام۔“ انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

”ہوٹل شو بھا۔“

”یہ نام تو ہندووانہ سا ہے۔“

”جی ہاں! اس کی مانگ ایک ہندو عورت ہی ہے۔“

”تب تو بن گیا کام۔ وہ آدمی وہی ہو گا۔ کیونکہ اس سال

میں شارجہ کا ہاتھ ہے اور وہ کسی ہندو سے ہی یہ کام

سکتے ہیں۔“ انپکٹر جمشید نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”تب پھر ہم بھی چل رہے ہیں۔“ خان رحمان بولے۔

”لیکن سمجھتی ہیں کیا کمروں کا؟“

”ٹھیک ہے پروفیسر صاحب۔ آپ چلیں۔“ انپکٹر جمشید نے کہا۔

جلد ہی وہ ہوٹل شو بھا کی طرف اڑے جا رہے تھے۔

پندرہ منٹ بعد انھیں دور سے ہوٹل شو بھا کی عمارت نظر

آنے لگی۔

”ویسے اکرام۔ اس ہوٹل کی رپورٹ کیا ہے؟“

”بہت نیک نام ہوٹل ہے۔ کوئی غلط بات سننے میں نہیں آئی۔“

”ہوں!“

وہ کار سے اتر کر ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے۔

عین اسی وقت محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیرت کا ایک شدید

جھٹکا لگا۔

کیا کہا

ہوٹل کے مال میں انھیں حمبروز میاں بیٹھے نظر

آئے تھے۔

”اوہو! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ محمود بڑبڑایا۔“

”کیوں۔ یہ کون شخص ہے۔“ انپکٹر جمشید نے اس کی نظروں

کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”حمبروز میاں۔ جن کی کوشٹھی تک کیمرے والا گیا تھا؟“

”اوہو اچھا۔ تب تو ہم بالکل درست جگہ پر آئے

ہیں۔“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”اچھا خیر۔ اسے ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہونا

چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔“ حمبروز میاں بھی اسی

سازش کا ایک مہرہ ہے۔“ انپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

وہ اندر داخل ہوئے اور ایک ایسی میز کی طرف بڑھے۔ جہاں سے جمبروز میاں فوراً انھیں نہ دیکھ سکے۔
”بھئی وہ تمہارا لمبا آدمی تو نظر نہیں آ رہا۔“ انہوں نے جیشید نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

”مجھے یہاں آنے کا اتفاق کئی بار ہوا ہے۔ اور میں نے اسے یہاں موجود پایا ہے۔ یہ بات یاد اس لیے رہ گئی کہ اس کا قد ہی ایسا ہے۔“

”ہوں! خیر۔ دیکھا جائے گا۔ وہ نہ سہی۔ جمبروز میاں سہی۔“ وہ مسکرائے۔

ایسی کوئی بات نہیں آتا جان۔ وہ بھی یہاں موجود ہے وہ دیکھیے۔ لفٹ سے نکل کر سیدھا جمبروز میاں کی میز کی طرف آ رہا ہے۔

”بہت اچھے۔ ہم درست راستے پر چل چکے ہیں۔“ انپٹر جیشید خوش ہو کر بولے۔

اور پھر لمبا آدمی جمبروز میاں کی میز پر آ کر بیٹھ گیا:

”ہم غلط میز پر بیٹھ گئے۔ تم ٹھہرو۔ جمبروز میاں مجھے نہیں پہچانتا۔“

”لیکن وہ لمبا آدمی تو پہچانتا ہے آپ کو۔“

”ہاں! لیکن تم فکر نہ کرو۔ میرے چہرے میں ابھی تبدیلی آ جاتی ہے۔“ انھوں نے کہا اور اٹھ کر ان کی میز کے نزدیک ایک خالی میز پر چلے گئے۔ اب ان کا چہرہ پہلے کی نسبت بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرائے۔
”کیوں نہ ہم بھی اسی میز پر چلیں؟ محمود نے بے چین ہو کر کہا۔“

”یہ مناسب نہیں رہے گا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو آتا جان ہمیں بتا ہی دیں گے۔“

وہ انتظار کرتے رہے۔ اچانک وہ دونوں اٹھے اور لفٹ کی طرف چل دیے۔ انھوں نے گھبرا کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انھیں اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پھر وہ ان کے تعاقب میں چلے۔ دونوں لفٹ میں سوار ہو کر اوپر جا چکے تھے، لفٹ نیچے آئی، وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”اب کیا کریں؟“
”میں اور فاروق نیچے ٹھہرتے ہیں۔ تم انھیں تلاش کرو۔ ہم کاؤنٹر سے ان کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے۔ کام کرنے والے اگرچہ مسلمان ہیں۔ لیکن اصل انتظام ضرور ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو گا۔ اور اگر یہ لوگ کسی طرح

اس سازش میں شریک ہیں تو پھر ان کی نظری ضرور ہم پر ہوں گی۔ اخبارات کی خبروں نے ہماری ناکامی کو خوب اچھالا ہو گا۔ لہذا انھیں یہ بھی خیال ہو گا کہ اب ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اچھی بات ہے۔ ہم انھیں جلد تلاش کر لیں گے۔ کیا آپ کو اطلاع دیں۔

”نہیں! تم خود ہی بنٹ لین۔ میں نیچے ہی ٹھہروں گا۔ نیچے بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔“

وہ اوپر پہنچے۔ ہوٹل میں بے تحاشا کمرے تھے۔ اور ان دونوں کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کس منزل پر اترے تھے۔

”کام بھی ہمارے ذمے عجیب عجیب لگتے ہیں۔“

سو کمرے تو ضرور ہوں گے۔ اور تین منزلیں ہے۔ ان

میں دو آدمیوں کو تلاش کرنا ہے۔ اب ہم سو کے سو

کمرے دیکھتے پھریں۔ فاروق نے چلے کٹے انداز میں کہا۔

”اگر تمہیں یہ کام اتنا ہی مشکل لگ رہا ہے تو پھر

تم نیچے چلے جاؤ اور آبا جان کے پاس بیٹھو۔“ فرزانہ نے

اسے گھورا۔

”تم چاہتی ہی ہو۔ میں کام چور مشہور ہو جاؤں؟“

میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم پہلے ہی مشہور ہو۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”اب جھنجھلا نے اور پیر پٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کام تو کرنا ہو گا۔“

وہ پہلی منزل سے شروع ہو گئے اور لگے ایک ایک کمرہ چیک کرنے۔ پھر دوسری اور اس کے بعد تیسری منزل کی باری آئی۔ آخر تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۹۴ میں انھیں حمروڑ میاں کی آواز سنائی دی:

”یہ۔ یہ۔ آپ کیا کر رہے ہیں مٹر زولان۔“

”میں ٹھیک کر رہا ہوں۔ ایک منٹ ٹھہریے مٹر

حمروڑ میاں۔“

اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ تینوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دروازے سے کان لگا دیے۔

اچانک دروازہ کھل گیا اور وہ اندر کی طرف لڑکھڑائے:

”آپ لوگ ہماری باتیں اندر آکر اطمینان سے ہی سن لیں۔“

یہ کہتے ہوئے بٹے آدمی نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

”بہت بہت شکریہ مٹر زولان۔“ محمود مسکرایا۔

”تشریف رکھیے۔“ اس نے کمریوں کی طرف اشارہ

کیا۔

وہ بیٹھ گئے اور ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے، جمہروز
میاں کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا:

”آ—آپ لوگ۔۔ وہ سہلانے لگا۔

”جی ہاں! یہ ہم لوگ ہی ہیں۔ کوئی اور لوگ نہیں؟ فاروق

نے منہ بنایا۔

”آپ تو وہی ہیں۔ وہ تعاقب والے۔ اس نے کہا۔

”ہم نے کب انکار کیا ہے جناب۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”آپ سے بھی ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور ان

سے بھی۔“ فاروق نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔

”تو مسٹر ذولان سے بھی آپ مل چکے ہیں۔“ جمہروز

میاں کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہم ان سے نہیں۔ یہ ہم سے ملنے آئے تھے۔“

محمود کے لہجے میں طنز تھا۔

”اوہ۔۔ وہ۔۔ ہاں بات تو ٹھیک ہے۔“ ذولان خوش

دلی سے مسکرایا۔

”بلکہ زیادہ ٹھیک بات یہ ہے کہ یہ اپنے دو ساتھیوں

سے ملاقات کرنے کے لیے آئے تھے، آخری ملاقات۔“

محمود بولا۔

”پتا نہیں۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ جمہروز میاں نے الجھن
کے عالم میں کہا۔

”آپ کے دوست ہماری بات کو اچھی طرح سمجھ رہے
ہیں۔“

”اوہ ہاں بالکل۔“ ذولان بولا۔

”مسٹر ذولان۔۔ مجھے بھی بتا دیں نا۔ کیا معاملہ ہے؟“

”ابھی نہیں۔ جب یہ لوگ چلے جائیں گے۔“

”اب ہم کہاں جائیں گے۔“ پہلے آپ کو یہاں سے روانہ
کریں گے۔“

”اوہ۔۔ مسٹر محمود۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے

پولیس کے حوالے کریں گے؟“

”دو آدمیوں کے قاتل کو ہم پھول کے ہار پہنا کر اوداع

تو کہنے سے رہے۔“ محمود بھٹتا اٹھا۔

”دو آدمیوں کا قاتل۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مسٹر

ذولان تو ایک مکھی بھی نہیں مار سکتے۔“

”ہاں اور کیا۔ ذرا انہیں میرے بارے میں بتائیے تو۔“

ذولان نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”اچھا کمال ہے۔ اس کا مطلب ہے۔“ مکھیاں انہیں انسانوں

سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“
 ”بس یہ کہ یہ دو آدمیوں کے قاتل ہیں۔ فرزانہ۔ تم انکل
 اکرام کو فون کرو۔“

”یہ انکل اکرام کون ہیں؟“ حمیروز میاں بولے۔
 ”انسپکٹر جمشید کے اسسٹنٹ۔“

”سب معلومات ہیں آپ کو۔“ محمود کے لہجے میں طنز تھا۔
 ”کیا کیا جائے۔ رکھنا پڑتی ہیں۔ اس نے کندھے اچکائے۔
 ”مشر زولان۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔“

ادھر فرزانہ فون کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اور جلدی
 جلدی نمبر ملا رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔ یہ تجھے گرفتار کر رہے ہیں۔“
 ”اور آپ گرفتار ہو جائیں گے۔“ حمیروز میاں کے لہجے
 میں حیرت تھی۔

”اور میں کمرہ ہی کیا سکتا ہوں۔ اس نے بے چارگی کے
 عالم میں کہا۔“

”اس طرح تو میں بھی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ یہ
 لوگ مجھ سے بھی پوچھیں گے کہ میں آپ کے ساتھ
 کیوں تھا۔“

”تو ہتا دیجیے گا۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے۔ میرے کہنے

پر کیا ہے۔“ زولان مسکرایا۔

”کیا مطلب۔ میں نے کیا کیا ہے۔“

”ان لوگوں کو ٹھکانے لگانے کا کام۔“ اس کا لہجہ اچانک سرد
 ہو گیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ زور سے چونکے۔

”کک۔ کیا مطلب۔ میں اور انھیں ٹھکانے لگاؤں گا۔ یہ
 آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”اب اپنی جان بچانے کے لیے آپ کو ہر کام کرنا ہی
 ہو گا۔ ورنہ یہ لوگ آپ کو بھی گرفتار کرائیں گے اور
 جب کیس چلے گا تو آپ کی گردن بھی پوری طرح پھنسنے
 گی۔ کیونکہ جب میں پھنسون گا تو باقی لوگ ضرور پھنسیں
 گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تو جیل میں سڑوں اور دوسرے
 باہر عیش کرتے رہیں۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔
 مجھ گئے آپ۔“

”نہیں! آپ کی ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔
 میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے۔“

”غاموش رہیے۔ میں آپ کو ایسی باتیں کرنے کی اجازت
 نہیں دے سکتا۔ یہاں میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلایا
 تھا۔“

”تو پھر کس لیے بلایا تھا۔“ حمیروز میاں نے جلدی سے

”یہ غلطی صرف اور صرف موت کے منہ میں لے جائے گی۔ میں رو آکھیں پیچھے بھی رکھتا ہوں۔“
محمود نے اپنے جسم میں عجیب سی سنسنی محسوس کی،
اور فرزانہ نے اسے اشارہ کیا۔

”رک جاؤ محمود۔ اس سے نہ الجھو۔“
اور زولان یوں کمرے سے نکل گیا جیسے مکھن میں سے
ال نکل جاتا ہے۔

”تم نے مجھے کیوں روکا فرزانہ۔“ اس نے براہِ اس
منہ بنایا۔

”رک تو تم خود چلے تھے۔“ فاروق نے طنزیہ لہجے
میں کہا۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ نہ جانے کیوں۔ میں حد درجے
ات محسوس کر رہا تھا۔“

”اسی لیے میں نے تمہیں روکا تھا۔ جب کہ ہم پہلے
ی خوف زدہ ہو چکے تھے۔ تو اس سے لڑتے کس
طرح۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ جمہورز میاں کھڑے
مڑے کس طرح مر گیا۔ آخر اس نے کیا کیا۔ کہ یہ
مڑے سے گرا اور ختم۔ نہ تڑپا۔ نہ چیخا چلایا۔ ساکت
ہو گیا۔“

کہا۔

”اس لیے کہ۔ مگر نہیں۔ اب اس کا موقعہ نہیں رہا۔ لہذا
میں جا رہا ہوں مٹر جمہورز۔ یہ میری اور آپ کی آخری ملاقات
ہے۔ بلکہ آج کے بعد تو آپ اور کسی سے بھی نہیں مل سکیں
گے۔ یہی تو مجھ میں بڑی بات ہے۔“

”کیا۔ کیا مطلب۔ آپ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ جمہورز
کی آنکھیں خون کی زیادتی سے پھیل گئیں۔ اسی وقت۔ وہ تڑپ
سے گرا۔ اور بے ہوش ہو گیا۔“

محمود، فاروق اور فرزانہ سناٹے میں آ گئے۔ اس کے
چہرے پر ایک نظر پڑتے ہی انہوں نے جان لیا تھا۔ وہ
مر چکا ہے۔

”یہ آپ نے کیا کیا مٹر زولان۔“
”اگر تم نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ تو
تم بھی اسی طرح گرد گئے اور مر جاؤ گے۔ کیا سمجھے۔“
”اچھا میں چلا۔ تم لوگوں کو زندگی کا تحفہ اس لیے دیے جا
رہا ہوں کہ انپکٹر جمشید کو اپنی بے بسی کی داستان سنا سکے۔“
”ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ جانے کے لیے مڑا۔ محمود
اس پر پھپھلاہٹ لگانے کے لیے جھبکا ہی تھا کہ وہ مڑے

بغیر بولا:

”واقعی۔ اس واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔“
 ”ہمارے گھر میں یہ شخص پہلے ہی دو آدمیوں کو
 ہلاک کر چکا ہے۔“
 ”ہوں۔ خیر۔ یہ تو ہوا۔ سوال یہ ہے کہ حمبروز
 میاں کا اس سے کیا تعلق ہے۔“
 ”مجھلا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ سننے کی مہلت
 ہی کہاں ملی ہے۔“
 ”فاروق تم نیچے جا کر آبا جان اور انکل کو بھی بلا
 لاؤ۔“

”اچھی بات ہے۔ اس نے کہا اور باہر کی طرف چلا۔
 ”مشکل ہے۔“ فرزانہ بولی، فاروق جاتے جاتے رک
 گیا۔

”کیا مشکل ہے۔“
 ”یہ کہ فاروق جا کر آبا جان اور انکل کو بلا لائے۔
 ”کیوں! اس میں کیا مشکل ہے۔“

”ذولان آخر ہوٹل کے دروازے سے ہی فرار ہو
 گا اور آبا جان اسے ضرور دیکھ لیں گے۔ پھر یہ کیسے
 ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا تعاقب نہ کریں۔ فرزانہ
 نے کہا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے۔ ذولان نے ہمیں ہال میں دیکھ
 لیا تھا، اس لیے وہ حمبروز کو لے کر اوپر آگیا۔ ان
 حالات میں تو وہ صدر دروازے سے فرار ہونے کی حماقت
 نہیں کر سکتا۔“

”خیر۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“
 جلد ہی فاروق، الیکٹر جمشید اور خان رحمان اندر داخل
 ہوئے:

”تو آپ اسے فرار ہوتے نہیں دیکھ سکے۔“
 ”پہلے آدمی کی بات کر رہے ہو۔“

”جی ہاں۔“
 ”تو وہ حمبروز میاں کو بھی ہلاک کر کے چلتا بنا۔ اور
 تم کچھ نہ کر سکے۔“

”ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ تو بہت عجیب سا
 آدمی ہے۔“

”مجھے جلدی جلدی بتاؤ۔ میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔“
 ”جی۔ کیا کہا۔ خوف محسوس کر رہے ہیں۔“

”ہاں! اس پہلے آدمی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“
 اس کا نام معلوم ہوا یا نہیں۔“

”جی ہاں! حمبروز نے اسے۔ اس کے الفاظ درمیان

میں رہ گئے۔

انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ انپکٹر جمشید آواز پیدا کیے بغیر دروازے کی طرف بچھٹے اور چٹخنی گراتے ہی دروازہ کھول ڈالنا چاہا۔ لیکن دروازہ نہ کھلا۔ کسی نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

”تو وہ ابھی ہوٹل سے فراہ نہیں ہوا تھا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔ پھر چونک کر بولے:

”تم کیا کہہ رہے تھے محمود۔ حمید روز نے اسے کس نام سے پکارا تھا؟“

عین اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ فرسٹ پر پڑی لاش کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔

”ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ تو ایک عدد لاش ہے؟“

”تو ہم نے کب اسے مردہ کہا ہے؟“ فاروق بولا۔

”یہ۔ یہ کیسے ہوا۔“ اکرام ہلکایا۔

”پوچھ لیجیے اسی سے۔ کم از کم ہم نے اس سے

نہیں کہا تھا کہ لاش میں تبدیل ہو جائے؟“

”کیا کہہ رہے ہیں بھئی؟“

”اکرام۔ تم اپنا کام کرو۔ ہم عجیب و غریب حالات سے دوچار ہیں۔ بیٹھ کر بات کریں گے۔ ارے ہاں۔“

وہ۔ اس کا نام پھر وہ گیا؟

”جی۔ اس کا نام زولان ہے؟“

”کیا کہا۔ زولان۔ کیا مطلب۔“ انپکٹر جمشید زور سے

اچھلے۔ ساتھ میں اکرام بھی چلایا تھا۔

ہماری ملک میں رہ کر

انہ کی آنکھوں میں حیرت اور خوف دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے :
"خیر تو ہے جمشید۔"

"جہاں زولان موجود ہو۔ وہاں خیر نہیں ہوا کرتی۔
تو شارجتان نے فائل کی چوری کے سلسلے میں زولان کی
خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ بہت بُرا ہوا۔"
"جی۔ بہت بُرا ہوا۔ آپ کا مطلب ہے۔ شارجتان
نے زولان کی خدمات حاصل کر کے بہت بُرا کیا ہے۔"
"اپنے حق میں تو اس نے اچھا ہی کرنے کی کوشش
کی ہے۔ لیکن دراصل شارجتان والے زولان کو نہیں جانتے۔
یہ سودا اچھے بہت مہنگا پڑے گا۔"
"آپ ذرا صاف صاف بات کریں۔"

"زولان دو دھاری تلوار ہے۔ اڈل درجے کا دھوکے باز
ہے۔ بڑے سے بڑا سودا کر کے دھوکا کرتا ہے۔ اگر
شارجتان نے اس سے فائل کی چوری کا سودا کیا تھا۔
تو پھر سمجھ لو۔ فائل ابھی شارجتان نہیں پہنچی۔"
"تو پھر؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلنا۔

"تو پھر یہ کہ فائل ابھی زولان کے پاس ہے۔ اور
ہم اس سے واپس حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔
کاش یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی۔ اس صورت میں
میں اسے نکلنے نہ دیتا۔"

"لیکن آپ اسے کس طرح روک لیتے۔" محمود نے کہا۔
"جان کی بازی لگا کر بھی اسے روکتا۔ تم لوگوں
کی زندگیوں بھی قربان کرنا پڑتیں تو کہہ دیتا۔ لیکن اسے
جانے نہ دیتا۔ لیکن نہیں۔ وہ اب بھی کہیں نہیں گیا۔
وہ یہاں سے جائے گا بھی کہاں۔ شارجتان کی ہدایات
پر اس ہوٹل کے مالکان نے اسے ہر طرح کی سہولت مہیا
کی ہوگی۔ آؤ سمجھتی۔ ذرا ہوٹل کی مالکہ سے بات کر
لیں۔ جلدی کرو۔ اکرام تم اس لاش کو سنبھالو۔"
"جج۔ جی بہتر۔" اس نے ہلکا کر کہا۔

وہ نیچے آئے۔ انپکٹر جمشید سیدھے کاؤنٹر پر

گئے۔

”ہمیں منر شوہیا سے ملنا ہے۔“

”اپنا کارڈ عنایت فرمائیں۔“

”کارڈ کے بغیر ملوا دیں۔ کارڈ میں ساتھ نہیں رکھتا۔“

وہ بولے۔

”آپ کاغذ کی چٹ پر اپنا نام لکھ دیں۔“

”ضرور۔ کیوں نہیں۔“ انھوں نے کہا اور کاغذ لے

کر اس پر زولان لکھ دیا۔

”کلرک نے چٹ لی اور اس پر لکھا ہوا نام پڑھا۔“

”پھر چونک کر اس نے کہا:

”کیا مطلب؟“

”آپ مطلب کس بات کا پوچھ رہے ہیں؟“

”چٹ پر آپ نے یہ اپنا نام لکھا ہے۔ اس نے حیرت

زدہ انداز میں کہا۔

”نہیں! اس شخص کے سلسلے میں مجھے منر شوہیا سے

ملنا ہے۔“

”اپنا نام بھی آپ کو لکھ کر دینا ہو گا جناب۔“

”بہت بہتر۔“ انھوں نے کہا اور جمشید احمد لکھ دیا۔

”کلرک نے وہ چٹ ایک بیرے کو دی اور بولا:

”دیوی جی کو دے آؤ۔“

”او کے سر۔“ بیرے نے کہا اور چٹ لے کر اندر

کی طرف چلا گیا۔

آدھ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اور جلدی

سے بولا:

”دیوی جی انھیں بلا رہی ہیں۔“

”جائیے جناب۔“ انھیں ان کے کمرے تک چھوڑ آؤ

بھئی۔“ کلرک نے کہا۔

”بہت بہتر۔“ بیرا بولا۔ اور وہ اس کے پیچھے چلتے

ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ پھر بیرا واپس پلٹ گیا۔

انھوں نے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت آرام

کرسی میں لیٹی ہوئی تھی۔

”آپ کا نام جمشید احمد ہے؟“

”ہاں منر شوہیا۔“

”آپ نے چٹ پر ایک اور نام لکھا ہے۔ زولان۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”مقتوڑی دیر پہلے زولان آپ کے ہوٹل میں موجود تھا۔“

اس نے کمرہ نمبر ۹۷ میں ایک آدمی کو ہلاک بھی کیا ہے۔“

لہذا ہم یہاں موجود ہیں۔“

”تو کیا آپ کا تعلق پولیس سے ہے؟“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”دیکھیے۔ اگر کوئی شخص میرے ہوٹل کے کسی کمرے میں کسی شخص کو ہلاک کر جاتا ہے۔ اس کی ذمے داری بھلا مجھ پر کس طرح ہو سکتی ہے؟“

”میں ذمے داری کب ڈال رہا ہوں۔ میں تو آپ سے زولان کا پتا پلوچھنا چاہتا ہوں۔“

”زولان کا پتا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ زولان کون ہے۔ پتا کیسے بتا سکتی ہوں۔ اس نے مجھنا کر کہا۔“

”اچھا! یہ بات ہے۔ خیر۔ مان لیتا ہوں۔ ویسے ایک بات سن لیں۔ زولان شارجتان کو دھوکا دے گا۔ وہ فائل ہرگز اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ ہاں اس صورت میں ضرور کر سکتا ہے۔ جب منہ مانگے دولت حاصل کرے۔ اور فائل کی ایک نقل اپنے آقاؤں کے لیے بھی رکھ لے۔“ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

”پتا نہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میرے پتلے تو نہیں پڑ رہیں۔“ اس نے مجھنا کر کہا۔

”اگر آپ پسند کرتی ہیں تو میں پوری وضاحت کیے دیتا ہوں۔ وہ بولے۔“

”لیکن کس چیز کی۔ میرا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے اگتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”پہلے سن لیں۔ پھر انکار کیجیے گا کہ آپ کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔“

”خیر۔ آپ کی مرضی۔ ضرور کریں وضاحت۔“

اب وہ کمرے پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے تفصیل سنا شروع کی۔ فائل کس طرح اڑائی۔ اور اس کے بعد وہ اس ہوٹل تک کس طرح پہنچے۔ یہ تمام باتیں کہہ کر وہ بولے:

”اب آپ ہی بتائیں۔ زولان کا آپ سے یا آپ کے ہوٹل سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں۔“ اس نے پُر زور لہجے میں کہا۔

”یہ بات نہ سمجھ لیں کہ آپ ایک ہندو عورت ہیں۔ اور ہمارے ملک کی ایک اہم فائل آپ کے ملک کے اشارے پر اڑائی گئی ہے۔“

”میں کب بھول رہی ہوں۔ لیکن میرے ملک کی حکومت کی ذمے داری آپ مجھ پر کیوں ڈال رہے ہیں۔ کیا میں وہاں کی وزیراعظم ہوں۔“ اس نے جلتے جلتے انداز میں کہا۔

”نہیں! آپ وہاں کی وزیراعظم نہیں ہیں۔ لیکن وہ آپ

کا وطن تو ہے اور سازش کرنے والے ذہن یہ معلومات تو رکھتے ہیں کہ دشمن ملک میں ان کا ہمدرد کون کون اور کہاں کہاں ہے۔ پھر وہ اس سے اپنی مرضی کا کام لیتے رہتے ہیں۔ کیا آپ اس بات سے بھی انکار کرتی ہیں کہ آپ اپنے ملک سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتیں اور اس کے لیے کوئی کام یہاں رہتے ہوئے نہیں کرتیں؟

”ہاں! نہیں کرتی۔ اب تو یہی میرا ملک ہے۔“ اس نے کہا۔

”تب پھر۔ مجھے پورے ہوٹل کی تلاشی لینا ہو گی؟“

”کیا کہا۔ تلاشی۔ آپ کے پاس وارنٹ ہیں۔“ اس نے بھڑک کر کہا۔

”میں وارنٹ کا محتاج نہیں۔ یہ اجازت نامہ ملاحظہ فرمائیے“

”اب آپ اس بٹن کو نہیں دبا سکتیں۔“ انپکٹر جمشید نے ایک بٹن کی طرف اس کا ہاتھ بڑھتے دیکھ کر کہا۔

وہ چونک اٹھی۔ چند سیکنڈ تک گھورتے رہنے کے بعد آخر اس نے پھنکار کر کہا:

”آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟“

”بس۔ زولان کا پتا بتا دیں۔ اگر وہ آپ کے ہوٹل میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے تو اس کے کمرے کا نمبر بتا

دیں۔ یا جگہ کی نشان دہی کر دیں۔“

”میں کسی زولان کو نہیں جانتی۔ اگر اس نام کا کوئی آدمی میرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے تو بھی مجھے نہیں معلوم۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔

”محمود۔ اکرام کو فون کرو۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا نظر نہیں آتا۔“ انپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

”گھی میں بس یہی بڑی بات ہے۔“ فاروق نے منہ بنایا اور محمود فون کرنے لگا۔

”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ چلائی۔“

”تلاشی لینے کا انتظام۔“

”تو آپ کا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے؟“

”یہ بات تو آپ کو پہلی نظر میں ہی معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا۔ آپ کو چمکتے ہوئے انپکٹر جمشید مسکرائے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑتا نظر آیا۔

”آپ مجھ سے سودا کر لیں۔“ اس نے بار مانتے ہوئے کہا۔

”سودا۔“ انپکٹر جمشید سوالیہ انداز میں بولے۔

”ہاں سودا۔ آپ میرے ہوٹل کی تلاشی لیں۔ میں

آپ کو زولان کا پتا بتا دیتی ہوں۔“

”اگر زولان اس جگہ نہ ملا تو تلاشی ضرور لی جائے گی۔“
سن لیں۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ اس نے جھٹکا کہا۔
”فرض کیا۔ آپ کوئی اوٹ پٹانگ پتا بتا دیتی ہیں۔“
اور ہم یہاں سے وعدہ کر کے چلے جاتے ہیں۔ تو پھر
کیا اس طرح ہم بے وقوف نہیں بن جائیں گے۔ انپکٹر جمشید
نے جلدی جلدی کہا۔

”اور آج کل ہم نے بے وقوف بننے کا پروگرام ذرا ترک
کر رکھا ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”کوئی جملہ تمہیں ضرور ہی بولنا ہوتا ہے۔“ فرزانہ جھٹکا اٹھی
فاروق مسکرا کر رہ گیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ تلاشی کی صورت میں بھی زولان کو
پتا نہیں بتاؤں گی؟“

”تم بھول رہیں ہو۔ یہ اقرار کر لینے کے بعد کہ تم زولان
کا پتا جانتی ہو۔ ہم تم سے معلوم کر لیں گے۔“

”کیا مطلب۔ میں انکار کر دیتی ہوں۔ میں نے یہ بات
نہیں کہی۔ اب آپ کیا کر لیں گے میرا۔“ اس نے چمک
کر کہا۔

”یہ گھڑی دیکھ رہی ہیں آپ۔ یہ صرف گھڑی نہیں۔“

میں یہاں ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔“
”اوہ!“ پہلی بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار
نمودار ہوئے۔

”اب آپ کو نہ صرف زولان کا پتا بتانا ہوگا۔ بلکہ ہوٹل
کی تلاشی بھی دینا ہوگی۔“
”نہن۔ نہیں۔“

”یہ ہوگا۔ ہو کر رہے گا۔“ انپکٹر جمشید نے سخت
لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر اس نے بٹن دبانے کی کوشش کی۔
لیکن انپکٹر جمشید کی غراہٹ نے اسے جامد کر دیا۔

اور پھر اکرام اور اس کے ماتحت وہاں پہنچ گئے۔
ان کے ساتھ لیڈی پولیس بھی تھی۔ اس نے مسز شوہیا
کو جکڑ لیا۔ انگ کمرے میں لے جا کر اس کی تلاشی لی
گئی۔ پھر ہوٹل کی تلاشی شروع ہوئی۔ لیکن زولان کہیں
نہ ملا۔

”اس کا ٹھکانا کہیں اور ہے۔ شاید۔“ فرزانہ بوڑھائی
”ہم نے ہوٹل میں کسی ترخانے کی موجودگی کے امکانات
کا جائزہ نہیں لیا۔“ فاروق نے خیال پیش کیا۔

”ہوں! واقعی۔ یہ کام تم تینوں کرو۔ میں مسز شوہیا کے

پاس سے ہٹ نہیں سکتا۔ وہ بولے۔

”بہت بستر۔“ تینوں ایک ساتھ بولے اور باہر نکل گئے۔ چند

سادہ لباس والے انھوں نے ساتھ لے لیے۔

نچلی منزل کے تمام فرش انھوں نے باری باری دیکھ ڈالے۔

لیکن کسی نہ خانے کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

”میرا دل کہہ رہا ہے۔ کہ یہاں کوئی نہ خانہ ضرور ہے۔“

اس قسم کے لوگ نہ خانے ضرور بنواتے ہیں۔“ فاروق بولا۔

”تمھارا دل غلط بھی کہہ سکتا ہے۔“ محمود نے منہ بنا کر کہا۔

”اور آج تو یقیناً غلط کہہ رہا ہے۔“ فرزانہ نے طنزیہ

کہا۔

”یہ بات تم یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”اس طرح کہ۔“ میرا دل کہہ رہا ہے۔ یہاں نہ خانہ

نہیں ہے۔“

”مت بھولو۔ منر شوجھا نے آبا جان سے سودا کرنا منظور

کہہ لیا تھا۔ آخر کیوں۔ اگر ذولان یہاں نہیں ہے اور

منر شوجھا اور بھی کوئی غلط کام نہیں کرتیں۔ تو۔ پھر وہ

سودا کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی تھی۔ اسے کیا خوف تھا۔“

”ہوں! آج تو تمھاری باتوں میں بہت وزن محسوس ہوا

ہے۔“ فرزانہ نے چومک کر کہا۔

”بے وزن باتیں تو بس تم کیا کرد۔ آؤ۔ ایک بار پھر تمام

فرشوں کا بغور جائزہ لیں۔“

اس مرتبہ انھوں نے نئے جوش کے ساتھ اپنا کام شروع

کیا۔ اور نہ خانے کی تلاش زمین سے شروع کی۔ ان کا تجربہ

تھا۔ جب وہ زمینی تلاش پر زور دیتے تھے۔ تو ایسے

کام ہو جاتے تھے۔ انھوں نے ہر کمرے کے فرش کو دیکھ

کر ذہن لڑانا شروع کیے۔ ہر کمرے کا فرش ایک جیسا تھا۔

کسی کمرے کے فرش میں دوسرے سے مختلف کوئی بات نظر

نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی

وہ چونک اٹھے۔ اس کمرے میں آتش دان موجود تھا۔ جب

کہ اور کسی کمرے میں آتش دان نہیں تھا۔

”یہ آتش دان میرے ذہن میں بڑی طرح چمک رہا ہے۔“

فاروق بڑبڑایا۔

”جب ہم پہلے یہاں آئے تھے۔ اس وقت کیوں نہیں

دیکھا۔“ فرزانہ نے طنزیہ بھے میں کہا۔

”عجیب بات ہے۔ آج میں کام کے موڑ میں ہوں اور

میں دونوں اکتائے ہوئے ہو۔ گویا الٹی گنگا بہنے لگی ہے۔“

”الٹی گنگا۔“ محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”کیوں! اس میں عجیب بات کیا ہو گئی۔ الٹی گنگا بہنا

پہلی بار سنا ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں۔ پہلی بار نہیں سنا۔ لیکن ایک ہندو عورت کے ہوٹل میں پہلی بار ضرور سنا ہے۔ ادھر دیکھو۔ آتش دان پر دریائے گنگا کی تصویر۔ یہاں بھی گنگا بہ رہی ہے۔"

ان کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔ انھوں نے پہلے اس کی طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ محمود پُر جوش انداز میں تصویر کی طرف بڑھا۔ پھر جو بھی اس نے تصویر کو کتاب کے ورق کی طرح اٹا۔ کمرے کے فرش میں ایک دروازہ نمودار ہوا اور انھیں سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آئیں۔

"وہ مارا۔ آخر ہم کامیاب ہو گئے۔ فرزانہ چکی۔"

"ہاں ہاں۔ باندھ لہ اس کامیابی کا سہرا اپنے سر پر؟" فاروق نے جل کر کہا۔

"میں سروں کی ایسی شوقین نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" خانے کی تلاش میں تم ہم سے آگے بڑھ گئے ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم شروع سے اس خیال پر ڈٹ گئے تھے کہ اس ہوٹل میں کوئی نہ خانہ نہیں ہے۔ جب آدمی شروع میں ہی اپنی شکست مان لیت ہے۔ تو پھر کامیابی اس کے نزدیک نہیں پھٹکا کرتی۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"خیر۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ میرا خیال

ہے۔ ہمیں بابا جان کو اطلاع دینی چاہیے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تم دونوں یہیں ٹھہرو۔ اور خوب چوکس رہو۔ ہو سکتا ہے۔ زولان نہ خانے میں ہو۔"

"تم فکر نہ کرو۔ جلدی جاؤ۔"

محمود دوڑ لگا گیا۔ جلد ہی انپکٹر جمشید، خان رحمان،

اکرام اور دوسرے ماتحت اندر داخل ہوئے۔ لیڈی پولیس بھی مندر شوہجا کو جکڑے ہوئے وہاں آ گئی۔

"مندر شوہجا۔ اب آپ کیا کہتی ہیں۔"

اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ بس

نفرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے کچا چٹا جانا چاہتی ہو۔

"کچھ تو بولیے۔ مندر شوہجا۔ اچھا چلیے۔ اتنا بتا

دیں۔ اس نہ خانے میں زولان تو موجود نہیں ہے۔ انپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں۔ وہ یہاں نہیں رہتا۔ نیلے گھاٹ پر ایک

ہٹ ہے۔ اس میں رہتا ہے۔ لیکن اس ہٹ سے

اسے گرفتار کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔"

"وہ ہمارا کام ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اور یہ

بتاؤ۔ بہت کا نمبر کیا ہے۔
 ”۳۱۵۔“ اس نے کہا۔

”اب یہ بات اس قدر آسانی سے کیوں بتا دی۔“
 ”اب چھپا کر کہوں گی بھی کیا۔ اب تو آپ مجھے
 گرفتار کر کے زبردستی بھی بات معلوم کر لیتے۔“ اس
 نے مردہ آواز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے۔“ تہ خانے میں ہمیں بہت کچھ
 ملنے والا ہے۔ چلو بھئی۔ پہلے تو ذرا نیچے کی سیر
 کر لیں۔“

وہ سب نیچے اترنے لگے۔ تہ خانے کے فرش
 پر قدم رکھتے ہی ان کی حیرت بہت بڑھ گئی۔ بہت سے
 بلبوں کی روشنی میں تہ خانے میں دن کا سماں ہو گیا تھا
 ایک چوترے پر کالی دیوی کا خوف ناک بت نصب تھا۔
 اس کی آنکھیں شعلے برساتی محسوس ہو رہی تھیں۔

چوترے پر پھیلا ہوا خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔
 دیوی کے دائیں طرف ایک چوڑے پھل والی تلوار رکھی تھی۔
 اس کے علاوہ تہ خانے میں ٹکڑی کی پیٹیاں بھی موجود
 تھیں۔ ایک پیٹی کو کھولا گیا۔ تو اندر ہیروئن بھری
 ہوئی تھی۔

”ہوں! تو مسلمانوں کو ہیروئن کا عادی بنانے کا کام بھی
 کرتی ہیں۔“ منر شوہجا اور شکار بھانسی کر دیوی کے چرنوں پر
 قربان بھی کیا جاتا ہے۔ تم نے اب تک نہ جانے کتنے مسلمانوں
 کو یہاں لا کر قتل کیا ہے۔ ملک میں گم ہونے والے
 کئی لوگ یہاں ذبح کیے گئے ہیں۔ انوس۔ ہمیں معلوم
 بھی نہیں کہ ہمارے ملک میں۔ ہمارے ملک کے سب سے
 بڑے شہر میں یہ اندھیر بھی ہوتا رہا ہے۔ منر شوہجا۔
 میں اس بات کو اس قدر عام کر دوں گا۔ کہ ہندوؤں کے
 خلاف مسلمانوں کے اندر نفرت کا لاوا ایلنے لگے گا۔ اور
 پھر جو ہندوؤں کا حشر ہو گا۔ وہ تم بھی دیکھو گی اُد
 سند گی۔ ہمارے ملک میں رہ کر تم ہمیں ہی اپنے
 بتوں کے آگے قربان کرو۔ اس کا انجام میں تمہیں
 دکھا کر رہوں گا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ خوف سے چلائی۔

”کیوں نہیں۔ کیا تم۔“

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت
 ایک بھیاںک چیخ گونج اٹھی۔

اُو بھٹی چلیں

چینج مسز شوہا کی تھی۔ چیخ کے ساتھ ہی وہ تڑ سے گرتی تھی اور پھر انھوں نے اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ دیکھی :

”ارے ! اسے کیا ہوا۔ اگراں بولا۔
”گئی کام سے۔ شاید اس نے خودکشی کر لی۔“ محمود بڑبڑایا۔

انپکٹر جمشید اس پر جھک گئے۔ اس کی پیشانی میں ایک نہایت باریک سوئی چھپی ہوئی تھی۔ اتنی باریک کہ جھکنے سے پہلے وہ سوئی انھیں نظر نہیں آ سکی تھی :
”ادھو۔ یہ خودکشی کا کیس نہیں ہے۔ قتل کیا گیا ہے اسے۔“ وہ چلائے۔

”جی کیا مطلب۔ لیکن یہاں تو ہم لوگوں کے علاوہ

کوئی نہیں۔ پھر اسے کس نے ختم کیا۔ یہ سوئی تو بلو پائپ کے بغیر پھینکی نہیں جا سکتی۔ اور بلو پائپ کو منہ سے لگانا پڑتا ہے۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”ہاں ! یہ بات بہت عجیب ہے۔“ یہ کہہ کر انپکٹر جمشید نے تہ خانے میں موجود تمام لوگوں کو دیکھا۔ ان کے ساتھیوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ چند لمحے کھڑے سوچتے رہے۔ پھر اس جگہ اور اس رخ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں گرنے سے پہلے مسز شوہا کھڑی تھی۔ اس کے قد کے مطابق اس کی پیشانی کی سیدھ میں انھوں نے دیکھا۔ وہ تہ خانے کی ایک دیوار کے بالکل سامنے کھڑی تھی اب وہ آگے بڑھے۔ اور دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار میں انھیں ایک باریک سا سوراخ نظر آ گیا۔ اب وہ اوپر کی طرف دوڑے۔ ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور پھر دھک سے رہ گئے۔ اس کمرے کے فرش میں بھی ایک عدد چوکور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ کھلا ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے۔ وہ نکلی گیا۔“ انپکٹر جمشید ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

”کک۔ کون۔“ فاروق ہسکلیا۔

”ذولان۔“ فرزاد بولی۔

”ہاں ! وہ یہاں موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ منر شوہجا پھنس گئی ہے اور اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے۔ تو اس نے بلو پائپ کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور شاید اس نے یہ سوراخ ہمارے تہ خانے میں آنے سے کچھ ہی پہلے کیا تھا۔ یہ دیکھو۔ یہاں اینٹوں کے کچھ ذرات پڑے ہیں۔ کچھ ذرات تہ خانے کے فرش پر بھی ہوں گے۔“

”یہ ذولان تو ہر قدم پر حیرت انگیز ثابت ہو رہا ہے۔“

”بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ ہمارے راستے میں روکاؤں ہی روکاؤں کھڑی کر دینے کے چکر میں ہے۔ وہ چاہتا ہے، ہم اس کیس کی تفتیش نہ کر سکیں۔“ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

”لیکن کیوں۔ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس وقت بھی آزاد ہے، اور آسانی سے ہمارے ملک سے فرار ہو سکتا ہے۔ پھر اسے یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت۔ جب کہ وہ فائل حاصل بھی کر چکا ہے۔“ فرزاد نے پریشان ہو کر کہا۔

”تمہارا سوال بہت اہم ہے فرزاد۔ اور اس پر ہمیں غور کرنا ہو گا۔ لیکن پہلے ہم نیلے گھاٹ پر ہٹ نمبر ۲۱۵ کو چیک کریں گے۔ خیال تو یہی ہے کہ منر شوہجا نے جھوٹ بولا ہو گا۔ لیکن ہمیں تو تصدیق کرنا ہی پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ یہاں کا کام تو انکل سنبھال ہی لیں گے۔ ہم ادھر ہو آتے ہیں۔“

وہ اسی وقت نیلا گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن نیلا گھاٹ میں ایک اور شخص ملا۔ چھوٹے سے قد کا بھاری بھر کم آدمی، اس نے انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا:

”ہمیں مسٹر ذولان سے ملنا ہے۔“

”کون ذولان۔ آپ ضرور غلط جگہ پر آ گئے ہیں؟“

”ذرا حلیہ سن لیں۔۔۔ شاید آپ نے انھیں اس پاس کسی مٹ میں دیکھا ہو۔ وہ بہت بڑے اور بہت دبے پتلے قد کے ہیں۔ دور سے بالکل بالٹس نظر آتے ہیں۔“

”نہیں جناب۔ اس طرف میں نے کبھی ایسے چلے کر آدمی کو نہیں دیکھا۔“

”شکریہ۔ آؤ بھئی چلیں۔“

وہ واپس چلے۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ زولان نے حمبور میاں کو کیوں ہلاک کیا۔ ہمارے خیال میں تو اس معاملے سے اس کا ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے محمود نے کہا۔

”زولان کا اس کو ہلاک کرنا تو اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ کوئی گہرا تعلق تھا۔“ فاروق بولا۔
”تعلق تھا یا نہیں تھا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ زولان نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ زولان ہر ایسے آدمی کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے۔ جس کا اس کیس سے ذرا سا بھی تعلق ہے۔ تاکہ ہم اس تک نہ پہنچ سکیں۔ اگرچہ وہ اس شہر میں ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا خیال یہ ہے کہ ہم تفتیش کرتے ہوئے تو اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ ویسے نہیں۔ لہذا وہ تفتیش کا ہر راستا کاٹ ڈالنے کے چکر میں ہے۔ اوہو۔ اس کا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے۔“

اور الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ انھوں نے کار کی رفتار یک دم بڑھا دی۔ اب وہ گویا اڑے جا رہے تھے۔ خان رحمان فوج محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے؛
”جشنید۔ کیا یہ رفتار خطرناک نہیں ہے۔“

”ایک شخص کی زندگی کا معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔ جلد پہنچ کر ہم اسے بچا لیں۔“ وہ بولے۔
”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ فرزانہ بے چین ہو گئی۔“

”وہ حمبور میاں کو ختم کر چکا ہے۔ منر شوبھا کو بھی۔ اب صدر دین اور راشد باقی ہیں۔ صدر دین کا معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن راشد کا ضرور کوئی تعلق لگتا ہے۔ اسے صدر دین کی کار لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی آخر۔ صرف اس لیے کہ اس کی اپنی کار خراب ہو گئی تھی۔ کار میں تو کوئی خرابی ایک منٹ میں پیدا کی جا سکتی ہے۔“
”تت۔ تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ راشد بھی اس معاملے میں شامل ہے۔“

”خیال یہی ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ہمیں زندہ مل گیا اور اس پر ہمارے جانے کے بعد حملہ نہ ہو، تب تو ہم سمجھ لیں گے کہ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن دوسری صورت میں اس کا تعلق بھی ماننا پڑے گا۔“

ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ وہ راشد کی کونٹھی کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ آخر ان کی

کار کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ بظاہر کسی گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ محمود نے آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ تیسری مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد ایک ملازم لڑکا باہر نکلا:

”ہمیں راشد صاحب سے ملنا ہے۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ ابھی انھیں خبر کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ لیکن جلد ہی واپس آیا۔

اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔

”وہ۔ وہ جاگ نہیں رہے۔“

”اوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ تیزی سے اس کمرے تک پہنچے۔ راشد اپنے بستر پر لیٹا تھا اور اس کی پیشانی میں بھی ویسی ہی ایک عدد سوئی موجود تھی۔

”پھر وہی سوئی۔“

”جی کیا مطلب؟ لڑکا چونکا۔“

”یہاں فون ہے۔“

”جی ہاں ہے۔ باہر برآمدے میں رکھا ہے۔“

”محمود اکرام کو فون کرو۔ وہاں سے فارغ ہو کر ادھر آ جائے۔“

”کیا معاملہ ہے جناب۔“ لڑکے نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہم سے پہلے کوئی ان سے ملنے آیا تھا۔“
”جی ہاں! ایک لمبے قد کے آدمی آئے تو تھے۔ بہت پتے ڈبلے۔“

”کیا وہ پہلے بھی کبھی ملنے آئے تھے۔“

”نہیں جناب۔ میں نے پہلے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔“

”تو پھر۔ کیا مسٹر راشد نے ان سے ملاقات کی تھی۔“

”ہاں جناب۔ انھوں نے انھیں اپنے اس کمرے میں ہی

بلا لیا تھا۔ مجھے چائے بنانے کا کہا اور میں باورچی خانے میں

چلا گیا۔ چائے کی ٹرے اٹھا کر لوٹا تو وہ جا چکے تھے۔

اور یہ سوئے نظر آئے۔ میں حیران ہو کر اپنے کام میں

لگ گیا۔“

”یہ مرچکے ہیں۔“

”کیا!!!“ وہ چلا اٹھا اور پھر رونے لگا۔

”یہاں اور کون کون رہتا ہے؟“

”یہ اکیلے ہی تھے۔“

”اوہ!“ ان کے منہ سے نکلا۔ پھر انھوں نے باقی گھر کا

بھی جائزہ لیا۔ لیکن کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ ایسے

میں انھیں صدر دین کا خیال آ گیا۔ وہ گھبرا گئے۔

”خان رحمان۔ تم یہاں اکرام کے آنے تک ٹھہرو۔ پھر

صدر دین کے ہاں آ جانا۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ ۱۰۹ گل خان روڈ۔
”اوہ! اچھا۔“

وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور گل خان روڈ پر پہنچے۔ صدر دین کے دروازے پر گھنٹی بجائی گئی اور یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی کہ صدر دین نے خود دروازہ کھولا ہے۔
”شکر ہے۔ آپ تو کم از کم زندہ ہے۔“ فاروق نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ۔ لیکن نہیں۔ مطلب تو ہم بیٹھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔“
”آئیے۔“ اس نے کہا۔

ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انھوں نے تفصیل سنائی اور پھر بولے:
”راشد آپ کے دوست تھے۔ یہ بات تو درست ہے تاہم“

”ہاں جناب! اس میں کوئی شک نہیں۔“
”تب پھر۔ راشد نے مجرموں کے لیے کام کیا تھا۔ ورنہ انھیں اسے ختم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے اشارے

پر راشد نے آپ سے کار مانگی۔ تاکہ اس کار کے ذریعے واردات کی جا سکے۔ پروگرام کے مطابق کار کو کسی اور جگہ چھپا کر اس کی گم شدگی کی رپورٹ بھی لکھوائی گئی۔ وہاں وہ زنجیر بھی جان بوجھ کر گرائی گئی۔ تاکہ ہم چکر میں پڑ جائیں۔ کار کے نمبر نوٹ کرنے کا ہمیں موقع دیا گیا۔ پھر ہمارے سروں پر کوئی چیز مار کر یہ الجھن پیدا کی گئی کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ مطلب صرف یہ تھا کہ ہم فوراً آپ کے پاس پہنچ جائیں یہاں سے آپ کو ہشایا جا چکا تھا۔ اور نقلی صدر دین موجود تھا۔ اس کی باتیں سن کر ہم فوراً وہاں پہنچ گئے، اور جالب کریم کو زنجیر کے بارے میں بتایا۔ اور اس طرح جالب کریم نقلی صدر دین کو بلانے پر مجبور ہو گئے۔ اور اس نے فائل پر ہاتھ صاف کر دیا۔ یہ ہے کل کہانی۔ اس وقت تک مجرم حمزہ میاں۔ سر شوہا اور راشد کو ختم کر چکا ہے اور ہمارا خیال تھا کہ اب آپ کی باری ہے، لیکن وہ ادھر نہیں آیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔“

”اُف مانک۔ یہ سب کیا ہے۔“
”یہ سب اس فائل کا چکر ہے۔ مجرم چاہتے ہیں۔“

فائل کی چوری کے سلسلے میں جن لوگوں سے ذرا سا کام بھی لیا گیا۔ انہیں سبھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔ تاکہ کوئی بات معلوم نہ کی جا سکے۔ اور وہ ہر طرح محفوظ رہیں؟

”مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“ صدر دین نے گھبرا کر کہا۔
”آپ کو ڈرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ اگر لمبے آدمی کو آنا ہوتا تو ہم سے پہلے ہی آ چکا ہوتا۔ کیوں کہ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔“
”یہاں حفاظت کے لیے ایک دو آدمی تو مقرر کرا دیں؟“

صدر دین بولا۔

”اچھا! اگرچہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں یہ کہہ دیتا ہوں۔“ وہ بولے۔
”باہر نکل کہ وہ کار میں بیٹھے۔ ایسے میں فرزانہ نے

کہا:

”ابا جان! مجھے ایک بہت خوف ناک خیال آ رہا ہے۔“
یہ کہ۔۔۔ وہ کہتے کہتے روک گئی۔

”ہاں! میں جانتا ہوں۔ کیا خیال آ رہا ہے۔ وہ خیال میرے پاس بھی آیا تھا۔“ وہ مسکرائے۔

”کیا مطلب۔ آیا تھا۔ تو پھر آپ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

”بس اسے واپس روانہ کر دیا۔“ وہ بولے۔
اسی وقت خان رحمان کی کار نزدیک آ کر رک گئی۔

”اب بچے ہو جمشید۔“ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔
”نہیں بھئی۔ ہم تو فارغ ہو کر باہر بھی نکل آئے ہیں۔ بس تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی چلتے ہیں۔“
”اں فرزانہ تم کیا کہہ رہی تھیں؟“
”مجھے ایک بہت خوف ناک خیال آیا ہے۔“
”جلدی بتاؤ۔“

”یہ سارا چکر اگرچہ زولان کا چلایا ہوا ہے اور زولان نے شارجان کے اشارے پر کیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے بھی کسی خاص آدمی سے کام لیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ خاص آدمی کون ہے؟“

”میں سمجھ گیا۔ تم صدر دین کا نام لینا چاہتی ہو۔ کیونکہ جہروز میاں اور راشد کو پہلے ہی ہلاک کر دیا گیا ہے۔“ انکسٹر جمشید مسکرائے۔

”میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ صدر دین خود ہی فائل لینے جالب کہیم صاحب کی کوشی تک پہنچا تھا۔ اور واپس آ کر اس نے اپنے کسی ملازم کے ذریعے خود کو اور سب

گھر والوں کو بندھوا لیا۔ آخر یہ کیا مشکل ہے۔“ فرزانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

”اوہ۔ اوہ۔“ محمود اور فاروق کے منہ سے نکلا۔

”اور اس نے خود ہی اپنی کار چوری کی۔ اس کے پاس کار کی دوسری چابی موجود ہی رہی ہوگی۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”جی ہاں بالکل۔ ہمارا تعاقب کرنے والا بھی راشد نہیں، اس کے میک آپ میں صدر دین کا ہی کوئی آدمی تھا۔ اس طرح ساری کمافی کی لڑیاں آپس میں ملتی چلی جاتی ہیں۔“

”گویا۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ۔ صدر دین بھی دراصل شارجہ کا ایجنٹ ہے۔ اور اس نے اسے زولان کے منصوبے میں پوری طرح مدد کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر زولان جو پردہ گرام اسے دیا۔ اس نے اس پر عمل کیا۔“

”جی ہاں امیں یہی کہنا چاہتی ہوں۔“

”یہ تمام خیالات میرے ذہن میں پہلے ہی آچکے ہیں میں اسی وقت سادہ لباس والوں کو اس کی نگرانی پر مقرر کر دیتا ہوں۔ ایک بات طے شدہ ہے۔ زولان نے صدر دین کو ہلاک نہیں کیا۔ باقی لوگوں کو اس نے مار

ڈالا ہے۔ کہ ہم ان سے کچھ معلوم نہ کر سکیں۔ جب کہ میرا خیال ہے، حیرت میاں اور راشد کچھ بتانے کے قابل تھے ہی نہیں۔ اور نہ مسز شوہجا کچھ بتا سکتی تھی۔ انھیں ضرور صدر دین کو بچانے کے لیے ہلاک کیا گیا ہے۔ ورنہ زولان صدر دین کو بھی ضرور ہلاک کرتا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے؟

”باتیں دل کو ٹگتی ہیں۔“ خان رحمان نے سر ہلایا۔

”لیکن ہم فوری طور پر اس پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ انتظار کریں گے۔ شاید زولان اسے ہلاک کرنے کے لیے آئے۔ اور ہمارا یہ خیال بے بنیاد ثابت ہو جائے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”اور اس دوران ہم زولان کی تلاش جاری رکھیں گے۔ نہ جانے وہ شہر میں کہاں موجود ہو گا؟ انپکٹر جمشید بولے۔

”زولان کی گرفتاری بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہماری کامیابی ادھوری ہو گی۔“ محمود نے کہا۔

”کامیابی۔ کونسی کامیابی۔ اس صورت میں تو صورت اور صرف ناکامی پہلے رہ جائے گی۔“ فاروق بولا۔

”ہاں واقعی فائل تو ہم پہلے ہی گنڈا چکے ہیں۔ فرزانہ نے اس کی تائید کی۔

”ایسا جالب کریم صاحب کی ضد کی وجہ سے ہوا۔ اگر وہ

مجھے فائل دے دیتے۔ یا کم از کم وہ جگہ دکھا دیتے۔
ارے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے
چھیل گئیں۔

”خیر تو ہے آبا جان۔ یہ بے موقع ارے کہاں سے
ٹپک پڑا۔“ فاروق کے لہجے میں حیرت در آئی۔

”سنو بھئی۔ جالب کریم صاحب نے فائل کے بارے میں
کسی کو بھی کچھ نہیں بتا رکھا تھا۔ ٹھیک ہے۔“ وہ ذرا
دیر کے لیے رُکے۔

”جی بالکل ٹھیک۔“ تینوں ایک ساتھ بولے۔

”تب پھر۔ صدر دین کے میک آپ میں آنے والا ذرا
اس تجویز تک کس طرح پہنچ گیا۔ اور ان کی ان میں فائل
اڑا کہ کس طرح چلتا بنا۔ جب کہ فائل کے بارے میں
جالب کریم صاحب کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا
”ارے۔ واقعی۔ یہ تو بہت عجیب بات ہے۔“

اور بالکل سامنے کی ہے۔ انہوں نے یہ ہے کہ پہلے ہمارا
خیال اس طرف کیوں نہ گیا۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”چلو شکر کرو۔ چلا تو گیا۔ اگر اب بھی نہ جاتا تو
تم کیا بگاڑ لیتیں۔“ فاروق مسکرایا۔

”کس کا کیا بگاڑ لیتیں۔“ خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

”جی۔ خیال بے چارے کا۔ ویسے انکل آج آپ پروفیسر
اصل کی کمی پوری کرتے نظر آ رہے ہیں۔“
”نہیں تو بھئی۔ میں نے تو کوئی سائنسی شوشہ نہیں چھوڑا۔“
وہ گھبرا کر بولے۔

”اس کا مطلب پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ نقلی صدر دین
نہیں۔ اصلی صدر دین تھا۔ اور صدر دین چونکہ جالب کریم
صاحب کا دوست ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے۔ کسی ملاقات
کے دوران اس نے باتوں باتوں میں فائل کے بارے میں پوچھ
لیا ہو۔“

”میرا خیال ہے۔ اس بارے میں ہمیں جالب کریم صاحب
سے ایک عدد ہلکی پھلکی سی ملاقات کر لینی چاہیے۔“ انکسٹر
جمشید نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

”ضرور چلیے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“

وہ اسی وقت جالب کریم کے پاس پہنچ گئے۔

”ضرور آپ لوگوں نے کوئی خاص بات معلوم کر لی ہے۔ گویا
ہم فائل واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ انہوں
نے خوش ہو کر کہا۔

”جی۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت تو ہم ایک
بات پوچھنے آئے ہیں۔“

”وہ کیا؟“ انھوں نے کہا۔

”آپ کا بیان ہے کہ آپ نے فائل کے بارے میں
..... کسی دوسرے کو نہیں بتایا۔ کہ کہاں رکھی گئی
تھی۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”اپنے دوست مسٹر صدر دین کو بھی کچھ نہیں بتایا۔“

”جی۔ جی نہیں۔ کسی کو بھی نہیں۔“

”تب پھر یہ کس طرح ہو گیا۔ فائل اڑانے والا۔ یعنی نقلی

صدر دین۔ یہاں موجود تھا۔ اس نے ہم سب کو ایک دم

بے ہوش کر دیا۔ اس تجوری تک گیا اور فائل نکال کر لے

گیا۔ اس فائل کو تلاش کرنے میں ذرا دیر بھی نہ لگی۔“

”اوہ۔ یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے۔“

”اور ہم اسی عجیب بات کے ذریعے مجرم تک پہنچیں

گے۔“ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

”بہت خوب۔ لیکن میری حیرت ابھی تک دور نہیں ہوئی۔“

”ہمارا خیال ہے۔ یہاں آنے والا نقلی صدر دین نہیں

تھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ زور سے اچھلے۔ ”انکھیں حیرت اور

خوف سے پھیل گئیں۔“

”مطلب یہ کہ وہ بالکل اصلی صدر دین تھا۔ اور کسی ملاقات

کے موقع پر اس نے ضرور آپ سے باتوں باتوں میں تجوری

کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔“

”نہیں۔ مجھے ایسی کوئی ملاقات یاد نہیں۔“ انھوں نے زور

دار انداز میں سر ہلایا۔

”بعض اوقات انسان بے خیالی میں ایسی بات کہ جاتا ہے

اور وہ آدمی کو یاد نہیں رہ جاتی۔“

”ہوں! اس کے باوجود میں تو یہی کہوں گا۔“ وہ بولے۔

”خیر۔ اب ہم چلیں گے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہاں نکل کر وہ صدر دین کے پاس پہنچے۔

”خیریت تو ہے۔ آپ کے چہروں پر جوش نظر آ رہا

ہے۔ کیا فائل کا چور پکڑا گیا۔“

”ابھی تک تو نہیں پکڑا گیا۔ لیکن امید ہے کہ بہت جلد

پکڑ دیا جائے گا۔ آپ سے ایک بات پوچھنے کے لیے آئے ہیں؟“

انپکٹر جمشید بولے۔

”اس کے لیے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ فون پر

مجھے پوچھ سکتے تھے۔“

”بعض باتیں سراغ رسانی میں فون پر نہیں پوچھی جاسکتیں۔“

محمود مسکرایا۔

”اودھ اچھا۔ یہ آپ جانیں۔ ہاں تو وہ کیا بات ہے۔“
 ”کیا جالب کہیم نے کبھی آپ سے اس فائل کا ذکر کیا تھا؟“
 ”فائل کا ذکر۔ نہیں تو۔ بھلا وہ مجھ سے کیوں ذکر کرتے۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ آؤ بھئی چلیں۔ وہ بولے۔
 ”بس۔ اتنی سی بات۔“ ان کے لمبے میں حیرت تھی۔
 ”جی ہاں! بعض اوقات اتنی اتنی سی باتوں سے ہم بڑے
 بڑے مجرم پکڑ لیتے ہیں۔“

”جی۔ کیا مطلب؟“ وہ چونک اٹھا۔
 ”کچھ نہیں۔ آؤ بھئی چلیں۔“

انہوں نے کہا اور باہر نکل آئے۔ ان کے چہرے پر
 ایک پُر اسرارہ مسکراہٹ تھی۔

یہ مرچکا ہے

وہ باہر نکلے ہی تھے کہ اکرام تیزی سے آتا نظر آیا۔
 اس کے چہرے پر بلا کا جوش تھا:

”ہم۔ میرے ماتحتوں نے زولان کو تلاش کر لیا ہے سر۔ وہ
 ہوٹل شوراہ میں موجود ہے۔“

”اور تمہارے آدمی بدستور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ
 جلدی سے بولے۔“

”ہاں سر! انہوں نے اس کے گرد نگرانی کا ایک جال
 پھیلا دیا ہے۔ اگر وہ نگرانی سے باخبر ہو گیا۔ تب بھی نکل نہیں
 سکے گا۔ اس نے بتایا۔“

”بہت خوب۔ ہم ابھی اور اسی وقت ہوٹل شوراہ چل
 رہے ہیں۔“

ان کا رخ ہوٹل کی طرف ہو گیا۔ گاڑیاں بہت تیز

چل رہی تھیں۔ یہاں تک کہ صرف دس منٹ بعد وہ گاڑیوں سے اتر کر ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور ان پر جوش کا ایک عالم طاری تھا۔ ہال میں داخل ہوا ہی انھیں اشارہ ملا اور انھوں نے زولان کو دیکھ لیا۔ ایک میز پر بیٹھا کھانے میں اس طرح مگن تھا جیسے کھانے کے سوا اسے دنیا کا کوئی کام نہ ہو۔ انھیں بہت حیرت ہوئی۔ زولان جیسا آدمی اس قسم کی غلطی کس طرح کر سکتا تھا۔ کہ محکمہ سراغ رسانی والے اس کی تلاش میں بھاگ دوڑ رہے ہوں اور وہ آ کر ایک ہوٹل کے ہال میں کھانا کھانے لگ جائے۔

وہ نزدیک کی ایک میز پر بیٹھ گئے اور اس کے فارم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو انپکڑ جھشید اٹھے اور اس کی میز کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے :

”بیلو مسٹر زولان۔“

وہ زور سے اچھلا اور سمجھ اس کا رنگ اڑ گیا۔ لیکن صرف ایک سیکنڈ کے لیے۔ دوسرے سیکنڈ اس نے مسکرا کر کہا :

”آپ کو یہاں دیکھنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔“

کمال ہے۔“

”آپ کی تلاش کے لیے پورے شہر میں جال بچھایا گیا تھا۔ سب اس جال میں آ گئے۔“

”اوہو اچھا۔ کاش مجھے یہ بات معلوم ہوتی کہ میری تلاش کے لیے اتنے بڑے انتظامات کیے گئے ہیں۔“

”اب آپ کا کیا خیال ہے۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں۔“

”ہمارے ساتھ چلنا ہو گا آپ کو۔“

”بہت بہتر۔ کیا میں بل ادا کر دوں۔ یا بل آپ ادا

کریں گے۔“

”آپ !“ انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

زولان نے مسکرا کر بل ادا کیا اور اٹھ کر ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ ان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ زولان نے ذرا بھی تو کوئی غلط حرکت نہیں کی :

”کک۔ کیا آپ نقلی زولان تو نہیں ہیں۔ فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

”یہ اندازہ کس بات سے لگا لیا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”ہم نے تو سنا تھا۔ زولان ایک بہت شان دار قسم کا مجرم ہے۔ لیکن جب وہ اس قدر آسانی سے پکڑا گیا

تو یہ خیال آنا قدرتی بات ہے :
 ”دراصل میں ہوٹل شوراب کے کھانے بہت پسند کرتا ہوں
 اور جب بھی اس شہر میں ہوتا ہوں، یہاں کا کھانا کھائے
 بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس مجبوری کی وجہ سے مجھے اپنی خفیہ
 جگہ سے نکلنا پڑا۔ بس میری غلطی یہ ہے کہ میں نے
 میک آپ کا سہارا بھی نہ لیا۔ دراصل میرا خیال تھا آپ
 لوگ یہاں نہیں آ سکیں گے۔ آپ تو اپنے خاص طریقے
 کے مطابق تلاش کر رہے ہوں گے۔“
 ”تو آپ کو یہ بھی معلوم ہے۔ کہ ہمارا خاص طریقہ کیا
 ہے۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

”بالکل۔ مجھے آپ کے بارے میں کیا معلوم نہیں۔“
 ”تب تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا۔ ہم فائل اڑانے
 والے کو تلاش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔“
 ”ہاں! لیکن میرا خیال یہ بھی تھا کہ آپ مجھ تک تو کیا
 میرے فرشتوں تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور یہی خیال مجھے
 مار گیا۔ لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔“ اس نے بے فکری کے
 انداز میں کہا۔

وہ محکمہ سرانصرسانی کی عمارت تک پہنچ گئے۔ اس
 نے اب تک فرار ہونے کی ایک بار بھی کوشش نہیں کی تھی:

ہسٹرزولان۔ کیا تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے؟
 فاروق بے چین ہو کر بولا۔
 ”ضرور کروں گا۔ لیکن اس وقت کروں گا۔ جب فرار
 ممکن نظر آئے گا اور ایسا موقع مجھے ضرور ملے گا۔ تم
 فکر نہ کرو۔“

مکرہ امتحان میں اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس
 نے پورے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور طنزیہ انداز میں مسکرا
 کر رہ گیا۔

”میں جانتا ہوں۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا؟“

”اچھی بات ہے۔ فائل کہاں ہے؟“

”میں جانتا ضرور ہوں۔ کہ فائل کہاں ہے۔ لیکن یہ بات
 بتاؤں گا نہیں۔“

”فائل والی تجوری کا آپ کو کس طرح پتا چلا تھا؟“

”جالب کریم کے ایک ملازم سے ان کے روزانہ کے کام
 کاج کی تفصیلات سرسری انداز میں پوچھتا رہا، اور اس طرح
 اس کمرے کے بارے میں جان گیا۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام
 نہیں تھا۔“

”بہت خوب؟ انپیکٹر جمشید نے تعریف کی۔“

”تو آپ نہیں بتائیں گے۔ فائل کہاں ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے پر زور انداز میں کہا۔

”اچھا۔ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ فائل کا کیا کہیں گے؟“
اس میں کوئی شک نہیں کہ فائل میں تے شارجستان کے کہنے پر
اڑائی ہے۔ لیکن اگر شارجستان اس فائل کی معقول قیمت نہ دے
سکا تو پھر میں اس کو کسی اور بڑی طاقت کے ہاتھ فروخت
کر دوں گا۔ اس فائل کے خریدار اور بھی نکل آئیں گے؟“
”اور اگر ہم آپ کو شارجستان سے زیادہ قیمت دے دیں
انپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”اس صورت میں فائل آپ کے حوالے کر دوں گا۔“ اس
نے کہا۔

”لیکن ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو آپ سے
ویسے ہی معلوم کر لیں گے۔ ہینگ لکے گی نہ پھنگوری۔
رنگ چوکھا آ جائے گا۔“ فرزانہ نے شرح آواز میں کہا۔

”غرض نہی ہے تم لوگوں کی۔ میں ایسے ہی ساتھ نہیں
چلا آیا۔ ساتھ آکر بتانا چاہتا تھا کہ مجھے اگر تم لوگ پکڑ
لو۔ تو بھی کیا ہے۔ فائل پھر بھی حاصل نہیں کر سکو
گے۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے بھئی۔ ہمارے پاس بھی کچھ
خاص آلات ہیں۔ زبان کھولنے کے۔“

”ساری زندگی اس قسم کے آلات سے میں تو کھیلتا رہا ہوں۔

اب بھی اپنے دل کی حسرت پوری کر لیں۔ آزمائیں ان کو؟ اس نے
بلند آواز میں کہا۔

زبان کھولنے کے آلات پر کام شروع کیا گیا۔ لیکن ان
ل حیرت بڑھتی چلی گئی۔ جب کہ وہ نہایت اطمینان سے سب کچھ
براہداشت کرتا رہا۔ نہ چیخا نہ چلایا۔ نہ اس نے شور مچایا۔ نہ یہ
کہا کہ ٹھہرو۔ بتانا ہوں۔ بس مسکراتا رہا۔ آخر کئی منٹ بعد
اس نے کہا:

”تمہارے آلات ختم ہو جائیں گے انپکٹر جمشید۔ لیکن تم میری
زبان نہیں کھولا سکو گے۔ اس لیے کہ میں نہایت اطمینان سے
تم لوگوں کے ساتھ چلا آیا تھا۔ ورنہ تم مجھے ہوٹل شہراب میں
بھی گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔“

”کیوں نہیں کر سکتے تھے۔“

”تب سمجھو۔ انپکٹر جمشید۔ میرا چیلنج قبول کرو۔ مجھے ہوٹل شہراب
جانے دو۔ میں ہال میں اسی میز پر بیٹھ جاتا ہوں۔ تم مجھے
دباں سے یہاں تک لے آؤ۔ میں فائل تمہارے حوالے کر
دوں گا۔“

”اوہ؟ ان کے منہ سے نکلا۔ لیکن ان کی آوازوں میں انپکٹر
جمشید کی آواز شامل نہیں تھی۔ انھوں نے پرسکون آواز

میں کہا:

”میں اتنا بے وقوف نہیں کہ ہاتھ آئے شکار کو چھوڑ دوں۔“
”نکل تو میں دیسے بھی جاؤں گا اور وہاں جا کر تمہیں فون
کروں گا۔ کہ آ جاؤ۔ میں ہوٹل شہراب میں موجود ہوں۔“
پکڑ لو۔

”اس کا مطلب ہے۔ ہوٹل شہراب بھی کسی ہندو کا ہے
انپکڑ جیشید نے مسکرا کر کہا۔

”ایک دم انہیں یوں لگا جیسے زولان کو حیرت کا
ایک نور دار جھٹکا لگا ہو۔ لیکن اس نے اس جھٹکے کو محسوس
نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر وہ بولا:

”تمہارا یہ خیال درست ہے انپکڑ جیشید کو ہوٹل شہراب
ایک ہندو کا ہے۔ یہ بات معلوم کر لینے کے بعد بھی
میرا چیلنج اسی طرح ہے کہ تم مجھے وہاں سے گرفتار کر کے
نہیں لا سکو گے۔“

”میں بچہ نہیں ہوں کہ اس قسم کے چیلنج قبول کرتا ہوں
تم میرے قبضے میں ہو۔ اگر اب کچھ نہیں بتا سکو گے تو
اس وقت کس طرح بتا دو گے۔“

”شکست کی صورت میں فائل تو حوالے کر دوں گا۔“ اس نے
کہا۔

”ابا جان! آخر اس میں کیا حرج ہے۔“ محمود نے بے چین
کہا۔

”گویا تم بھی یہ چاہتے ہو۔ کہ میں مسٹر زولان کو چھوڑ دوں۔“
انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں! چاہتے تو ہم یہی ہیں۔“
”لیکن فرض کیا۔ مسٹر زولان ہم سے چال چلنے کی فکر میں
ہوں اور اس طرح فرار ہو جائیں۔ تو پھر ہم ہاتھ ملنے کے
واپس کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہ سن لو۔“

”تو مل لیں گے ابا جان۔“ فاروق جلدی سے بولا۔
”ایک بات اور سن لو۔ اس وقت جیرال یا سی مون
تم لوگوں کا مقابلہ نہیں ہے۔ زولان بہت دھوکے باز
چال باز مجرم کا نام ہے۔“

”تو کیا ہوا ابا جان۔“
”گویا تم چاہتے ہو۔ ہم یہ مقابلہ کر ہی لیں۔“
”ہاں! ایسا کر کے دیکھ ہی لیا جائے۔ کمرہ امتحان کے
ات تو ناکام ہو چکے ہیں۔“

”ان کی بات نہ کرو۔ ابھی میرے پاس کچھ اور طریقے بھی
ہے۔ وہ بولے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ فرزانہ نے کچھ سوتھ کر کہا۔

”کیا مطلب۔ کیا تم تینوں نیچے ہٹ رہے ہو۔“
 ”جی ہاں! آپ کا خیال ہی ٹھیک ہے۔ ہاتھ آیا شکار دیا
 بہتر ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ اب آپ اسے اپنے کسی خاص
 ٹھکانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”پتا نہیں۔ میرا جسم کیا ہو گیا ہے۔ کوئی چوٹ نہیں
 لگتی۔ انپیکٹر صاحب۔ ذرا میرے منہ پر یا جسم پر کسی جگہ بھی ایک
 بھر لوہا ٹکاتا تو مار کر دیکھیں۔“

”اچھا۔ تو یہ ہے۔“ انھوں نے ایک بھر لوہا مٹکا اس کے
 جڑے پر جڑ دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ٹکے سے اس کا
 جڑا ٹوٹ جائے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا،
 اس کا جڑا تو اپنی جگہ سے ہلایک نہیں ہٹا اور نہ وہ گرا
 ہٹا۔ لوہہ دیا ضرور ہٹا۔

”بہت خوب۔ حیرت ہوئی یہ دیکھ کر۔“ انپیکٹر جمشید
 بولے۔

”اور اب اگر میں چاہوں۔ تو تم سب کو تنگی کا ناپاچ
 بھی بچا سکتا ہوں۔ لیکن پہلے میں ذرا ان ویسی آلات کا مزا
 تو چکھ کر دیکھ لوں۔ چلو شروع ہو جاؤ انپیکٹر۔“

”انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے سارے آلات آزما
 لیے۔ اس کے بعد اس نے کہا:
 ”بس۔ ختم ہو گئے آلات۔ اور آپ مجھ سے فائل کے
 جمشید بولے۔“

”کیا مطلب۔ کیا تم تینوں نیچے ہٹ رہے ہو۔“
 ”جی ہاں! آپ کا خیال ہی ٹھیک ہے۔ ہاتھ آیا شکار دیا
 بہتر ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ اب آپ اسے اپنے کسی خاص
 ٹھکانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”پتا نہیں۔ میرا جسم کیا ہو گیا ہے۔ کوئی چوٹ نہیں
 لگتی۔ انپیکٹر صاحب۔ ذرا میرے منہ پر یا جسم پر کسی جگہ بھی ایک
 بھر لوہا ٹکاتا تو مار کر دیکھیں۔“
 ”اچھا۔ تو یہ ہے۔“ انھوں نے ایک بھر لوہا مٹکا اس کے
 جڑے پر جڑ دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ٹکے سے اس کا
 جڑا ٹوٹ جائے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا،
 اس کا جڑا تو اپنی جگہ سے ہلایک نہیں ہٹا اور نہ وہ گرا
 ہٹا۔ لوہہ دیا ضرور ہٹا۔

”بہت خوب۔ حیرت ہوئی یہ دیکھ کر۔“ انپیکٹر جمشید
 بولے۔

”اور اب اگر میں چاہوں۔ تو تم سب کو تنگی کا ناپاچ
 بھی بچا سکتا ہوں۔ لیکن پہلے میں ذرا ان ویسی آلات کا مزا
 تو چکھ کر دیکھ لوں۔ چلو شروع ہو جاؤ انپیکٹر۔“

”انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے سارے آلات آزما
 لیے۔ اس کے بعد اس نے کہا:
 ”بس۔ ختم ہو گئے آلات۔ اور آپ مجھ سے فائل کے
 جمشید بولے۔“

بارے میں معلوم نہیں کر سکے۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مجھے ہوٹل شراب سے گرفتار کر کے دکھا دو۔ میں فائل کے بارے میں خود بخود بتا دوں گا۔

وہ کہتے ہیں رہ گئے۔ اس قسم کے مجرم سے ان کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ آخر انپکٹر جمشید بولے: مجھے منظور ہے۔ لیکن ہم یہاں سے ہوٹل تک تمہیں خود لے کر جائیں گے۔ یہ نہیں کہ یہاں سے آزاد کر دیں اور کر دیں کہ تم ہوٹل پہنچو۔ ہم آ رہے ہیں۔ منظور ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

عمود، فاروق، فرزانہ، خان رحمان اور اکرام نے حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ اب وہ اسے لے کر ہوٹل شراب کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل کے سامنے پہنچ کر انھوں نے اسے ہال تک جانے کی اجازت دی۔ وہ ہال میں اسی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ جس پر کھانا کھا رہا تھا۔ اکرام اور اس کے ماتحت اب یہاں نہیں تھے۔

”تم لوگ ہوٹل کے دروازے پر موجود رہو۔ میں جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔
”یہ سب کچھ کس قدر عجیب لگ رہا ہے۔“ فرزانہ بڑبڑاتی۔

”کیا مطلب۔“

”کیس یہ کوئی چال تو نہیں چلے گا۔“
”وہ چال کیوں نہیں چلے گا۔ جب کہ اس نے ہمیں

کھلا چیلنج دیا ہے۔“
انھوں نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ اس کی میز کے نزدیک پہنچ کر بولے:

”کیا اب ہم تمہیں گرفتار کرنے کے پروگرام پر عمل شروع کر سکتے ہیں؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ٹکڑ ٹکڑ سامنے

دیکھتا رہا۔

”مشر زولان۔ کیا سو گئے۔ اور آنکھیں بند کرنا بھول گئے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

اس کی طرف سے اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔
انپکٹر جمشید نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ سیدھا میز پر آ رہا۔ اس کا سر زور سے میز پر لگا۔ اس پاس کے لوگوں نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔

”اوہو۔ یہ۔ یہ کیا ہوا بھئی۔“ انپکٹر جمشید گھبرا گئے۔
ان کے باقی ساتھی بھی وہیں آ گئے۔ انپکٹر جمشید نے

جلدی سے اس کے نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ نبض ساکت تھی
دل کی حرکت بھی بند تھی۔
”یہ۔ یہ تو مر چکا ہے۔“
”کیا!!!“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

لات کا انجام

ہال میں موجود لوگ اٹھ اٹھ کر ان کے ارد گرد
جمع ہونے لگے۔

”آپ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ ہوٹل کا کوئی
آدمی مہربانی فرما کر ڈاکٹر کو فون کرے۔ یہ صاحب شاید اس
دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میں ایک بار پھر اطمینان کر
لوں۔“ یہ کہہ کر انھوں نے زولان کی کلائی پکڑ لی اور نبض
دیکھنے لگے۔ نبض بند تھی۔ دل کی حرکت بھی بند تھی۔
ایسے میں انھیں کوئی خیال آیا:

”فرزاد۔ ذرا تم اپنے کان کام میں لانا۔ دل کی دھڑکن
سنو۔“

”جی بہتر۔“ فرزاد نے کہا اور آگے بڑھ کر دل کی دھڑکن
سننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر اس نے حیرت زدہ آواز

میں کہا:

”دل کی دھڑکن موجود ہے۔ لیکن آواز بہت کم ہے۔“
 کمال ہے۔ مجھے تو بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
 خیر۔ ڈاکٹر صاحب ہی آ کر فیصلہ کریں گے۔“ انھوں نے کہا
 کلائی اب تک ان کے ہاتھ میں تھی۔ پھر انھوں نے اکرام
 کی طرف دیکھا:

”تم ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ یہ
 حضرت اپنی اس چال میں ناکام ہونے کے بعد کوئی دوسری
 چال ضرور چلیں گے۔“

”چال۔“ کئی لوگوں کے منہ سے نکلا۔

”کیا ڈاکٹر کو فون کر دیا گیا ہے؟“

”میں تو ابھی چکا ہوں۔“ ایک آواز ابھری۔ انھوں

نے دیکھا۔ ایک ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا ان کی طرف آ رہا
 تھا۔

”آپ کا نام۔“ انپکڑ جمشید بولے۔

”میرے نام کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”آپ اتنی جلدی کس طرح آ گئے۔“

”میرا کلینک ساتھ ہی ہے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”بہت خوب۔ نام بتانے میں کیا حرج ہے۔“ انپکڑ جمشید

مسکرائے۔

”کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر ڈنگا ہوں۔“

”لگتے بھی ہیں۔“ فاروق بول اٹھا۔ وہ بہت دہلا پتلا

اور ٹیڑھا میڑھا سا آدمی تھا۔

”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر ڈنگا جھلا کر اس کی طرف پٹنا۔

”یہ کہ آپ ڈاکٹر ڈنگا ہی لگتے ہیں۔“

وہ بڑا سا منہ بنا کر زولان پر جھک گیا۔ پھر

جلدی سے بولا:

”یہ۔ یہ مر چکا ہے۔“

”چلو چھٹی ہوئی۔ آپ ذرا اپنا کارڈ دکھائیے۔“ انپکڑ

جمشید بولے۔

”پہلے آپ میرا نام پلوچھ رہے تھے۔ اب کارڈ مانگ

رہے ہیں۔ آخر کیوں؟“

”ہمارے خیال میں یہ شخص ابھی زندہ ہے۔ آپ کہتے

ہیں مر چکا ہے۔ لہذا پہلے ہم یہ تصدیق کریں گے کہ آپ

ڈاکٹر ہیں بھی یا نہیں؟“ انپکڑ جمشید بولے۔

”یہ کیا مذاق ہے۔ مجھے کس نے فون کیا تھا۔ اس

ہوٹل کے مالک کہاں ہیں۔“

”میں ادھر ہوں۔ اور کافی دیر سے یہ تماشہ دیکھ رہا

ہوں۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔ لیکن اس طرح میرا ہوٹل ضرور بدنام ہو جائے گا۔ اس لیے مہربانی فرما کر ان صاحب کو فوراً یہاں سے ہسپتال لے جایا جائے۔ یہ مرچکے ہیں یا زندہ ہیں۔ اس کا فیصلہ آپ لوگ باہر جا کر کریں؟

”لیکن یہ یہاں بے ہوش ہوا ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”تو پھر اس میں میرا کیا قصور؟“

”میرا خیال ہے۔ یہ یہاں کی کوئی چیز کھا کر بے ہوش ہوا ہے۔“ انپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

”بالکل غلط جناب۔ یہ تو ابھی ابھی ائے تھے۔ ابھی انھوں نے کسی چیز کا آرڈر نہیں دیا۔“ ایک بیرے نے تیز آواز میں کہا۔

”اور یہ بات بھی غلط ہے کہ یہ تھوڑی دیر پہلے بھی یہاں موجود تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ اسی میز پر۔“ انپکٹر جمشید نے تیز آواز میں کہا۔ اور میرا بنگلیں جھانکنے لگا۔

”دیکھا۔ میری بات ثابت ہو گئی۔ ان صاحب نے یہاں کا کھانا کھایا تھا۔ لہذا ہوٹل کے غلات بھی تحقیقات ہو گئی۔ اکرام۔ تم اپنا کام کر چکے ہو یا نہیں۔“ افسوس نے جلدی جلدی کہا۔

اکرام کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ باہر انتظام میں مصروف ہے۔

”ٹھیک ہے۔ اب انھیں ہسپتال میں لے جاتے ہیں ڈاکٹر نے کہا۔“

”ضرور کیوں نہیں۔ ایمبولینس آپ بلائیں گے یا میں۔“

”میں بلاتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے فوراً کہا۔

انپکٹر جمشید کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”فرزاد تمہارا شکریہ۔“

”جی کیا مطلب۔ یہ شکریے کا کون سا موقع ہے اور کس بات کا شکریہ۔“ فرزاد گھبرا گئی۔

”اگر تم نے یہ بات نہ بتائی ہوتی کہ زولان کے دل کی حرکت ابھی موجود ہے تو میں ان کی چال میں آگیا تھا اور زولان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔“

”جی۔ کیا مطلب۔“

”اس ہوٹل کا مالک۔ زولان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب بھی ان کے اپنے آدمی ہیں۔ زولان کی اس حرکت کا مطلب یہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہذا اب یہ اپنی ایمبولینس منگا کر یہاں سے غائب ہو جانا چاہتے تھے۔ لیکن جوفی میں نے اپنی ایمبولینس منگانے کی بات کی۔ ان

دو دنوں کے چہرے بکھ سے گئے۔ میں اس دوران ان کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ہوں۔

”پتا نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی ایک بات بھی پتے نہیں پڑی۔“

”ابھی کیا ہے جناب۔ آگے آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اُدھی بات بھی آپ کے پتے نہیں پڑے گی۔“ فاروق چہکا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ آپ نے اپنا کارڈ نہیں دکھایا۔“

”کلینک سے اٹھا کر لے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب آپ جا نہیں سکتے۔“

”آخر کیوں۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”اس لیے کہ آپ لوگ زولان کے ساتھی ہیں۔“

میں اسی وقت انپکٹر جمشید کے منہ پر زولان کی لات لگی۔ وہ بری طرح گرے۔ زولان نے ایک لمبی جھپٹا لگائی اور ہوٹل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن اسی وقت اس نے محسوس کیا۔ کوئی اس کی گردن سے پٹ گیا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فرزانہ اس کی گردن سے چمٹی ہوئی تھی۔ ”ہم تمہیں آسانی سے فرار نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی فائل بھی واپس لینا ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”تم بھی دیں جا کر گرو۔“ اس نے جھٹکا کہہ کر ایک جھٹکا مارا۔

فرزانہ نے اگرچہ اپنے ہاتھوں کو بہت مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ لیکن جھٹکا لگتے ہی وہ دور جا کر گری۔ اب زولان پھر دروازے کی طرف مڑا۔ لیکن محمود، فاروق اور خان رحمان اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”ابھی ہم باقی ہیں۔“

”تم لوگوں کو کرا دینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ کہہ کر وہ ربڑ کی طرح اچھلا۔ اور ایک ساتھ ان تینوں کے سروں پر اس کے ہاتھ اور لاتیں لگیں۔ وہ یک دم ڈھیر ہو گئے۔ اتنا پھرتیلا آدمی آج تک ان کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ ان کے گرتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ انپکٹر جمشید اس کے راستے میں کھڑے تھے۔

”اوہو۔ انپکٹر جمشید۔ ابھی تم میں دم خم ہے۔“

”ہاں! میں بے خبری میں مار کھا گیا۔ کم از کم مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم وار کدو گے۔“

”خیر۔ اب تو بے خبر نہیں ہو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں

”نہیں۔“ وہ بولے۔

”دو پھر۔“ سنبھلو۔“ اس نے کہا اور اچھلا۔ انپکٹر جمشید بھی اس کے ساتھ ہی اچھلے۔ دونوں فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ دونوں ہی گرے۔ لیکن زولان کسی گیند کی طرح اچھل کر سیدھا ہو گیا جب کہ انپکٹر جمشید کو اٹھنے میں ایک سیکنڈ لگ گیا۔ اتنی دیر میں وہ دروازے کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ انپکٹر جمشید نے بھی اٹھتے ہی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور کمر پر سے اسے پکڑ لیا۔ پہلی بار زولان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے:

”یہ کیا ہوا بھئی۔ آپ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔“

”کیا کبھی نہیں ہوا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”یہ کہ مجھ سے کوئی پوری قوت سے ٹکرایا ہو اور پھر بھی پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل رہ گیا ہو۔“

”خپلو۔ آج تو ہو گیا۔ اب کیا پروگرام ہے۔“

”ایک جھٹکا لگاؤں گا۔ اور آپ اڑتے ہوئے دور جا کر گریں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہاں سے دور جا چکا ہوں گا۔ آپ کے یہ لوگ میرا راستا نہیں روک سکیں گے۔“ اس

نے ہوٹل کے باہر موجود سادہ لباس والوں کی طرف اشارہ کیا۔

”میں جھٹکے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

اس نے جھٹکا مارا۔ انپکٹر جمشید پوری طرح تیار تھے۔ وہ زولان کے جسم سے الگ نہ ہو سکے۔ دور گرنے کا تو سوال ہی کیا تھا۔ اب زولان کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

”آپ جیت گئے انپکٹر جمشید۔ آئیے فائل آپ کو دیتا ہوں۔ فائل اسی ہوٹل کے کمرے میں موجود ہے۔“

”اکرام۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دو۔“

”ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

اکرام نے آگے بڑھ کر ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ اب وہ اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھے۔ تیسری منزل کے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر وہ جوہنی اندر داخل ہوئے۔ ایک گرج دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

”ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“

انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ہوٹل کا مالک اور ڈاکٹر ڈنگا وہاں موجود تھے اور ان کے پستول ان کی طرف اٹھے ہوئے تھے:

”بہت خوب۔ یہ بھی ٹھیک رہا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔
 ”اور مسٹر زولان کی ہتھکڑیاں کھول دو۔“ ڈاکٹر
 ڈنگا گر جا۔

”ضرورت۔ کھول دو بھئی اکرام۔“

”ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو انپکٹر جمشید
 کا دل خوش کر رہا تھا۔ یہ دیکھیے مسٹر جمشید۔“ اتنا
 کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں سے
 نکال لیے۔ پھر طنزیہ انداز میں بولا:

”میں ربڑ کا بنا ہوں۔ ربڑ کا۔“

”لیکن کون سے کارخانے میں۔“ فاروق تڑ سے

بولا۔

”اپنے ملک کے جسمانی ورزشوں کے کارخانے میں۔“

وہ بولا۔

”خیر۔ فائل کا کیا رہا۔ وہ ہمارے حوالے کر رہے ہو
 یا نہیں۔“ انپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

”اب پانسہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ فائل کی بجائے
 ہم آپ لوگوں کی جانیں لیں گے۔ اور لاشیں ہوٹل کے
 نیچے والے گٹر میں بہا دیں گے۔ جو لوگ باہر کھڑے
 ہیں۔ انھیں آپ لوگوں کو تلاش کرنے کی دعوت دیں

گے۔ لیکن ان کے فرشتے بھی آپ کو تلاش نہیں کر سکیں
 گے اور ناکام لوٹ جائیں گے۔ کیسا پروگرام ہے۔“
 ”اچھا ہے۔ اب ذرا میرا پروگرام سنو۔ بلکہ سنو۔
 نہیں۔ دیکھو۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اچھلے۔ اور ان دونوں
 سے ٹکرا گئے۔ انھیں ان کی طرف سے اس حرکت کی
 ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ غار بھی
 نہ کر سکے۔ دوسرے لمحے پستول انپکٹر جمشید کے ہاتھوں
 میں تھے۔ اور وہ ان سے کڑ رہے تھے،

”اب ہاتھ اٹھانے کی باری تمھاری ہے۔“

”بہت خوب۔ بھئی یہ بات ماننا پڑے گی۔ انپکٹر جمشید
 بھی میں ہماری ٹکڑ کے۔“ زولان نے خوش ہو کر کہا۔
 ”فائل نکالو۔“

”افسوس! ایک بھی کام میں نہیں کر سکتا۔“

”تم نے کہا تھا۔ اگر میں ہوٹل سے فرار نہ ہو سکا۔ تو
 فائل پیش کر دوں گا۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو۔“

”کون سا وعدہ۔ کہ، کیا تھا میں نے۔ میں جبرال یا
 سی سون نہیں ہوں۔ دھوکے بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔
 کیا سمجھے۔“

”سمجھ گیا۔ گھٹی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ محمود کمرے کا دروازہ بند کر دو۔ اب ان سے ذرا دو دو باتیں کر ہی لیں۔“

محمود نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔

”ہوٹل کے مالک اور ڈاکٹر ڈلگا کی مرمت تم لوگ کرو گے۔ زولان سے میں نبٹتا ہوں۔“

”اسی انتظار میں تو ہوں۔“ زولان نے ہنس کر کہا۔ انسپکٹر جمشید ایک ایک قدم اٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ زولان کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ ادھر محمود، فاروق اور فرزانہ ان دونوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور آن کی آن میں ان کا کچھ نکل کر رکھ دیا۔

”ان میں تو اب ہلنے کی سکت نہیں رہی۔“ فاروق بولا۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن ان پر نظر ضرور رکھنا۔“

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ایک بھرپور ٹکٹا زولان کے منہ پر مارا۔ انھیں بہت حیرت ہوئی۔ اس کا سرٹ سر ہلا تھا۔ قدم وہیں جمے رہے تھے۔ انھیں واقعی یوں محسوس ہوا جیسے ریل کی کسی چیز پر ٹکٹا مارا ہو۔

”دوسرا ٹکٹا آزمائیے انسپکٹر صاحب۔“ وہ چہرکا۔

”دوسرا بھی حاضر ہے۔ اس مرتبہ انھوں نے دوسرے ہاتھ کا ٹکٹا رسید کیا۔ لیکن پہلے کی طرح اس کا سر دوسری طرف جھکا اور پھر اپنی جگہ آ گیا۔ اب انھوں نے اس کے پیٹ میں ٹکٹا مارا۔ وہ قدرے آگے کو جھکا اور سیدھا ہو گیا۔“

”بھئی تم تو پچ پچ ریل کے بنے ہوئے ہو۔“

”تو کیا آپ کا خیال یہ تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”ہوں۔“

”میں سمجھا تھا۔ تم نے یہ بات مذاق میں کہی ہے۔“

”خیر۔ اب تو یقین آ گیا۔ کوئی اور ٹکٹا آزمانا ہو۔“

”تو۔ آزما لیں۔“ وہ بولا۔

”ہاں! ابھی میں کوشش جاری رکھوں گا۔“ یہ کہہ کر

انھوں نے اس کے پیٹ میں ایک بھرپور لات رسید کی۔

اس لات کا انجام بھی سکتے جیسا ہوا۔

”اور کچھ۔“

”ایک کوشش اور کروں گا۔“

”ضرور کریں۔“ اس نے بے فکری سے کہا۔

انسپکٹر جمشید تیزی سے آگے بڑھے۔ اسے کمر کے

پاس سے ہکڑ کر سر سے اوپر اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔

اس دوران اس نے خود کو بچانے یا ان کی گرفت سے

چھڑانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔

دوسرا لمحہ حیران کن ترین تھا۔ دیوار پر لگے ہی وہ گیند کی طرح اچھل کر ان کی طرف آیا اور ان سے ٹکرا گیا۔ وہ بڑی طرح دیوار سے ٹکرائے، لیکن ٹکراتے ہوئے بھی وہ ایک کام کر گئے۔ ساتھ ہی وہ زولان کو بھی پکڑ چکے تھے اس طرح زولان بھی ان کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ ادھر وہ اچھلا۔ ادھر انپکڑ جمشید اس کے زور میں اچھلے اور کمرے کے درمیان میں آ کر گرے۔

حیرت

باقی رنگ اس حیرت انگیز ترین لڑائی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں زولان کی آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی:

”میرا مقابلہ اگرچہ آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ انپکڑ جمشید بھی نہیں کر سکے۔ نہ کر سکیں گے۔ لیکن جس انداز سے انھوں نے کیا ہے۔ آج تک کوئی اور نہیں کر سکا۔ حیرت ہوئی ہے۔ ان سے لڑ کر۔ اور اگر یہ مشہور ہیں تو بلاوجہ نہیں۔ انھوں نے ضرور جبریل، سی مون اور جی مون جیسے دشمنوں کو شکست دی ہوگی۔ اس سے پہلے میں یہی خیال کرتا رہا کہ یہ سب فرضی باتیں ہیں۔ بلاوجہ مشہور کر دی گئی ہیں۔ لیکن آج اندازہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گیا۔“

”فائل کہاں ہے؟“ انیکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔
 ”فائل میں صرف شکست کی صورت، میں دے سکتا ہوں اور
 ابھی تک آپ مجھے شکست نہیں دے سکے۔“
 ”اچھی بات ہے۔ اب شکست کے لیے تیار ہو جاؤ۔“
 انھوں نے جل کر کہا۔

یہ کہتے ہی انھوں نے اس کے سر کے بالوں کو
 مٹھی میں جکڑ لیا اور بولے:

”مٹر زولان۔ آپ ذرا حرکت کر کے دکھانا۔“

”یہ۔ یہ کیا۔ یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہو گئی۔
 کہ اگر میرے بال قابو میں کر لیے جائیں تو میں حرکت بھی
 نہیں کر سکتا۔ یہ بات تو میں نے آج تک کسی کو بھی
 نہیں بتائی۔“

”میں لڑائی بھڑائی کے دوران بھی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔
 تم مجھے ہر لمحے اپنے بالوں کی طرف سے فکر مند نظر آئے۔
 بار بار تم نے ہاتھ بالوں پر پھیرا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت
 نہیں تھی۔ لیکن یہ نفسیاتی کمزوری ہے۔ ایسی کمزوری بڑے
 سے بڑے آدمی میں ہو سکتی ہے۔ مٹر زولان اب میں
 تمہارے بال اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک کہ
 تم فائل میرے حوالے نہیں کر دو گے۔“

”افسوس! میں اپنے بالوں کا کوئی علاج نہیں کر سکا۔
 جو بھی میرے بال پکڑے جاتے ہیں۔ مجھے سخت تکلیف ہوتی
 ہے۔ اتنی سخت کہ کیا بتاؤں۔“
 ”تب۔ تم ان پر استراکیوں نہیں پھروا دیتے۔“ فاروق
 نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں! میں نے سوچا تھا۔ لیکن استرے سے میری جلد پر
 اور بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ دراصل جسم کو بڑکی
 طرح لچک دار بنانے کے سلسلے میں مجھے عجیب و غریب درزیں
 کرنا پڑیں۔ اور اس طرح میرے سر کی جلد بہت نازک ہو
 گئی۔ ڈاکٹر بھی اس کا کچھ علاج نہیں کر سکے۔“

”ہوں! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ دراصل قانون بھی
 یہی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک لحاظ سے کوئی بہت بڑی طاقت
 حاصل کر لیتا ہے۔ تو دوسری طرف اسے کوئی نہ کوئی کمزوری
 بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں فائل کے بارے میں جاننا چاہتا
 ہوں۔“

”اس شکست کے بعد مجھے اصولی طور پر فائل دے دینا چاہیے،
 ویلے بھی میں فائل اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا، وہ میرے
 کس کام کی؟ اس نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

”اصولی طور پر نہیں۔ مجبوری کے طور پر۔ اس وقت

تم میرے قابو میں ہو، ورنہ فائل میرے حوالے کرنے کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اصول جس چیز کا نام ہے۔ وہ تو تمہارے پاس سے چھو کر بھی نہیں گزری۔“

”بات یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا اب دیکھیے۔ میں فائل کہاں سے نکال کر آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اس نے شروع آواز میں کہا اور اپنے ہاتھ پٹروں کے نیچے ڈال کر کمر کی طرف لے گیا۔ ہاتھ واپس آئے تو اس میں فائل موجود تھی۔ اس کا مطلب ہے۔ فائل ابھی تک شارجستان کے حوالے نہیں کی گئی۔ انسپکٹر جمشید خوش ہو گئے۔

”نہیں! ابھی تو میں ان سے سودا بازی کر رہا تھا۔“

فائل اڑانے کا اٹھوں نے مجھ سے سودا ضرور کیا تھا۔ اور رقم بھی ملے کر لی تھی۔ لیکن میں بھلا اس سودے پر کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ فائل حاصل کرنے کے بعد میں نے انہیں اطلاع دی۔ اور بتایا کہ وہ رقم مجھے منظور نہیں۔ اب اگر وہ مجھے مزہ مانگی رقم نہ دے سکتے تو میں یہ فائل انشارجہ کے حوالے کر دیتا۔ کیوں کہ انشارجہ کو بھی اس فائل سے بہت دلچسپی ہے۔“

اور ونڈاس کو۔“

”اس کا نمبر تیسرا ہے۔ اس نے کہا۔“

”اللہ کا شکر ہے کہ فائل جوں کی توں ہم نے واپس کر لی۔ اچھا یہ بات بھی درست ہے کہ فائل حاصل کرنے کے لیے تم بھی جالب کریم کے گھر پہنچے تھے۔“

”ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”لیکن تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ فائل کہاں موجود ہے۔“

”میں نے ایک دن مسٹر جالب کریم پر ہینٹائز کر کے یہ بات معلوم کر لی تھی۔ اس نے چپک کر کہا۔“

”کیا!!!“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”کیا تم مجھے ہینٹائز کر سکتے ہو۔“

”پتا نہیں۔ آپ بہت زبردست قوت ارادی کے مالک ہیں، ایسے آسانی سے نہیں ہوتے۔“

”تم کوشش تو کرو۔ اس طرح یہ ہادی ہوئی بازی تم آسانی سے جیت سکو گے۔“ فائل پھر تمہارے ہاتھ میں ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میرا خیال ہے۔ میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔“

”بھئی۔ کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔“ لوظہنی طور

”پروا نہیں۔ آپ کے ملک کی کوئی جیل مجھے ایک دن سے زیادہ دیر اندر نہیں رکھ سکتی۔“

”ایسا دعویٰ نہ کرو۔ ورنہ ہم تمہیں اپنی ذاتی جیل میں رکھ سکتے ہیں۔ محمود نے جھٹکا کر کہا۔“

”یہ بھی کہہ کے دیکھ لیں۔ وہ مسکرایا۔“

”نہیں محمود۔ ہم یہ نہیں کریں گے۔ اسے باقاعدہ

نہج میں پہنچائیں گے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ دو ملکوں کا

عالمہ ہے۔ ایک ملک نے ہمارے ملک کے خلاف سازش

کی ہے۔ اور اس سازش میں زولان سے کام لیا ہے۔

اس پر تو باقاعدہ مقدمہ چلے گا۔ اور پھانسی دی

جائے گی۔“

”پھانسی کا خواب ہی دیکھ سکتے ہیں انپکٹر۔ ابھی وہ

ی نہیں بنی جو میرا گلا گھونٹ سکے۔ تم ہی اپنے دونوں

ہتھوں سے میرا گلا گھونٹ کر دکھا دو۔“

”ابھی نہیں۔ اگر پھانسی کی رسی کام نہ کر سکی

میری انگلیاں ہی یہ کام کریں گی۔“

”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔“

”بات کر لکھ لیں۔“

”ایک منٹ۔ فاروق نے کہا اور پوکھلا کر جیب

میں ہاتھ ڈال دیا۔“

پر میں بھی زیر اثر آ جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔“

”اچھا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ میری آنکھوں میں

آنکھیں ڈالیں۔“ اس نے گویا تنگ آ کر کہا۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔ یہ تو انپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔“

”یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں آبا جان۔ آخر ایسا کرنے

کی کیا ضرورت ہے۔ فائل خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ فرزانہ

کو خوف محسوس ہوا۔

”ٹھہرو جیٹی۔“ انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

”انپکٹر۔ تمہیں بند آ رہی ہے۔ تم سو رہے ہو۔ ہاں تم

سو رہے ہو۔ پس سو جاؤ۔ سو جاؤ۔“

وہ ایک منٹ تک یہ جملے دہراتا رہا۔ لیکن ان کی

آنکھوں میں ذرا بھی نیند کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ انپکٹر

جمشید بغور اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ان کے چہرے

پر حیرت نمودار ہوئی اور وہ بولے:

”تمہارا یہی خیال ٹھیک تھا۔ مسٹر زولان۔ تم مجھے پہناتے

تھے۔“ انپکٹر جمشید نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

”تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ اس نے تھکے تھکے

میں جیل بھی جانا ہو گا۔“

تم فائل میں

”پروا نہیں۔ آپ کے ملک کی کوئی جیل مجھے ایک دن سے زیادہ دیر اندر نہیں رکھ سکتی۔“

”ایسا دعویٰ نہ کرو۔ ورنہ ہم تمہیں اپنی ذاتی جیل میں ہی رکھ سکتے ہیں۔“ محمود نے جھٹکا کر کہا۔

”یہ بھی کہہ کے دیکھ لیں۔“ وہ سکرایا۔

”نہیں محمود۔ ہم یہ نہیں کہیں گے۔ اسے باقاعدہ

ان میں پہنچائیں گے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ دو ملکوں کا

عالم ہے۔ ایک ملک نے ہمارے ملک کے خلاف سازش

کی ہے۔ اور اس سازش میں زولان سے کام لیا ہے۔

اس پر تو باقاعدہ مقدمہ چلے گا۔ اور پھانسی دی

جائے گی۔“

”پھانسی کا خواب ہی دیکھ سکتے ہیں انپکٹر۔ ابھی وہ

انہیں بنی جو میرا گلا گھونٹ سکے۔ تم ہی اپنے دونوں

مقربوں سے میرا گلا گھونٹ کر دکھا دو۔“

”ابھی نہیں۔ اگر پھانسی کی رسی کام نہ کر سکی

میری انگلیاں بھی یہ کام کرسکیں گی۔“

”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔

بات کو لکھ لیں۔“

”ایک منٹ۔“ فاروق نے کہا اور بوکھلا کر جیب

باتھ ڈال دیا۔

پر میں بھی زیر اثر آ جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں؛

”اچھا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ میری آنکھوں میں

آنکھیں ڈالیں۔“ اس نے گویا تنگ آ کر کہا۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔ یہ لو۔“ انپکٹر جھشید خوش ہو کر بولے۔

”یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں آبا جان۔“ اسخو ایسا کرنے

کی کیا ضرورت ہے۔ فائل خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ فرزانہ

کو خون محسوس ہوا۔

”ٹھہرو جھٹی۔“ انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

”انپکٹر۔ تمہیں بند آ رہی ہے۔ تم سو رہے ہو۔“ ہاں تم

سو رہے ہو۔ پس سو جاؤ۔ سو جاؤ۔“

وہ ایک منٹ تک یہ جملے دہراتا رہا۔ لیکن ان کی

آنکھوں میں ذرا بھی نیند کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ انپکٹر

جھشید بغور اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ان کے چہرے

پر حیرت نمودار ہوئی اور وہ بولے:

”تھکرا یہی خیال ٹھیک تھا۔ مسٹر زولان۔ تم مجھے پہنچانا

نہیں کر سکتے۔“ انپکٹر جھشید نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ اس نے تھکے تھکے

انداز میں کہا۔

”خیر۔ اب تمہیں جیل بھی جانا ہو گا۔“

”کیا بات ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو تم۔“ انپکٹر جنرل نے اسے گھورا۔

”قلم کاغذ تلاش کر رہا ہوں جیب میں۔ تاکہ بات لکھ سکوں۔“

خان رحمان ہنس دیے۔ محمود اور فرزانہ نے بڑا سا منہ بنایا۔

”بس! بل چکا تمہیں قلم اور کاغذ۔ اس جیب میں تو بڑی بڑی چیزیں غائب رہتی ہیں۔“ فرزانہ نے چلنے لگے انداز میں کہا۔

”خیر۔ پھر پروگرام کینسل کر دیتا ہوں۔“ اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

اب وہ زولان کو لے کر روانہ ہوئے۔ ان کے بال بدستور ان کی سمٹھی میں تھے:

”آئندہ ملاقات میں تم میرے بال نہیں پکڑ سکو گے انپکٹر۔ میں نے ترکیب سوچ لی ہے۔“

”ترکیب آج سے پہلے کیوں نہ سوچی تھی۔“

”کسی کو میری اس کمزوری کا پتا نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔

”مزدور ترکیب استعمال کر لینا۔ اگر تمہیں موقع ملا۔“ انپکٹر نے بولے۔

زولان کو جیل حکام کے حوالے کر کے اور اچھی طرح ہدایات دے کر اور زولان کی خصوصیات کے بارے میں بتا کر وہ وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔

”اب رہ گیا اصل مجرم۔“ انپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”اصل مجرم۔ تو کیا آپ زولان کو اصل مجرم نہیں سمجھتے۔“ محمود نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

”نہیں۔ زولان کو تو دراصل اصل مجرم کو پہچاننے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تاکہ زولان کے چکر میں اصل مجرم کی

طعن دھیان نہ جا سکے۔ لیکن زولان سے ایک چوک ہو گئی۔ اور اس کی اس چوک نے مجھے بتا دیا کہ اصل مجرم کون ہے۔“

”جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں بھئی۔ آؤ۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ تیز رفتاری سے چلتے ایک کوٹھی تک پہنچے۔

محمود بولا:

”یہ۔ یہ تو صدر دین کی کوٹھی ہے۔“

”ہاں! آؤ۔“ وہ مسکرائے۔

محمود نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ جلد ہی ایک ملازم کی صورت نظر آئی:

”سٹر صدر دین ہیں۔“

”جی ہاں جناب۔ اندر تشریف رکھتے ہیں۔“

”ہیں ان سے ملنا ہے۔“

”بہت بہتر جناب۔“ اس نے کہا اور انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

صدر دین اندر داخل ہوا۔ انھیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔
”اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کروں۔ ایک فون کر سکتا ہوں؟“
”ضرور۔ کیوں نہیں؟“

انپیکٹر جمشید نے فون کے نمبر گھمائے اور پھر سلاٹنے پر بولے:

”سر۔ میں اس وقت صدر دین صاحب کی کونٹری پر ہوں۔ آپ ذرا جلد یہاں تشریف لائیے۔“

وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے۔ پھر بولے:

”بس آپ چلے آئیے۔“ یہ کہہ کر انھوں نے ریسپورڈ دیا۔

پھر صدر دین کی طرف مڑے:

”آپ کی اجازت سے ایک فون اور۔“

”ضرور ضرور۔“ اس نے کہا۔

اب پھر انھوں نے کسی کے نمبر ملائے، اور

صرف اتنا کہہ کر ریسپورڈ رکھ دیا:

”میں ۱۰۹ گلی روڈ پر ہوں۔“

”آپ کا انداز بہت پُر اسرار سا ہے۔ خیر تو

ہے۔“

”ہاں جناب خیریت ہے۔ فکر نہ کریں۔“ وہ مسکرائے۔

محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان نے ان

کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ جیسے کہ رہے ہوں۔

فکر کیوں نہ کرے۔ اس بے چارے کو تو اب فکر ہی

فکر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔

اور پھر کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

”میں انھیں اندر لے آؤں۔“ یہ کہہ کر انپیکٹر جمشید

جلدی سے اٹھے اور باہر کی طرف پکے۔

”لگ۔ کن کو۔“ صدر دین نے پریشان ہو کر

کہا۔

انپیکٹر جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ واپس

پلٹے تو ان کے ساتھ جالب کریم تھے۔ اور ان کے

چہرے پر بلا کی حیرت تھی۔ اور جالب کریم کو دیکھ

کر ان سب کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔

اڑانے کا پروگرام بنایا۔ اور اس کام کے لیے اس کی فزول زولان پر پڑی۔ کیونکہ زولان نے صوت جمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی بہت زیادہ چالاک ہے۔ شارجستان کے ذلے دار لوگوں نے زولان سے ملاقات کی ہو گی اور اسے اپنا منصوبہ بتایا ہو گا۔ اب زولان نے سوچنا شروع کیا۔ آخر اس نے باقاعدہ ایک منصوبہ بنایا۔ ایسا منصوبہ کہ فائل ہی اڑا لی جائے۔ اور اصل آدمی بھی بچ جائے۔ کیونکہ معاملہ اصل آدمی کو بچانا تھا۔

اصل آدمی کو بچانا۔ کیا مطلب؟

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

”میں دراصل ان حضرات کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نے تفصیل شروع کرنے کا حکم دیا تو مجبوراً شروع کر بیٹھا۔ ایک منٹ مٹھریں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں اٹھیں لے آتا ہوں آبا جان۔“ محمود جلدی سے بولا۔

”نہیں بھئی۔ مجھے جانا چاہیے۔“

اور پھر وہ بڑے بڑے آفیسرز اور اعلیٰ عہدوں کے چند بچوں کو ساتھ لے اندر آئے۔ انھوں نے اندر جالب کریم کو دیکھا تو حیرت سے پلکیں جھپکانے پر مجبور ہو گئے۔

”یہ کیا چکر ہے بھئی؟“

ایک بات اور

”یہ۔ یہ سب کیا چکر ہے بھئی۔“ جالب کریم نے حیران ہو کر کہا۔

”آپ تشریف رکھیے سر۔ میں ابھی تفصیل سناتا ہوں۔“

”اچھا! انھوں نے کہا اور بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ انتظار کرتے رہے۔ آخر رہا نہ گیا:

”ہاں تو تفصیل شروع کریں نا۔“

”جی ہاں۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں۔ تفصیل کہاں سے شروع کروں۔ یہ معاملہ بہت عجیب اور ٹیڑھا ہے اور میں اس کے ٹیڑھے پن کو سیدھا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“

”پتا نہیں۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ صدر دین بڑبڑایا۔

”خیر۔ یہ عرض کرتا ہوں۔ ہمارے ملک کا ملک شین سے بہت ہی خفیہ قسم کا ایک عدد دفاعی معاہدہ ہوا تھا۔ ہمارا دشمن ہمایہ شارجستان ہر قیمت پر یہ معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ معاہدہ کیا ہے۔ لہذا اس نے اس فائل کو

”پاک شین معاہدے کا چکر۔ انپکڑ جمشید مکرانے۔
”کیا مطلب؟“

”اب مجھے نئے سرے سے تفصیل میں جانا پڑے گا۔
بلکہ تمام باتیں بتانا ہوں گی۔“

”کوئی حرج نہیں۔“ جالب کریم بولے۔

انہوں نے دوبارہ تمام تفصیل بیان کی۔ جو پہلے ہی بیان کر چکے تھے۔ اس کے بعد بولے :

”یہاں تک میں ان حضرات سے کہ چکا تھا۔ اب آگے کی سنیے۔ شارجتان کا ایک اہم ترین آدمی ہمارے ملک میں جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اور نہ جانے کتنی مدت سے انجام دے رہا ہے۔ شارجتان کو سب سے زیادہ فکر اس کی تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اس پر کسی کو بھی شک نہ گزرے اور فائل شارجتان پہنچ جائے۔ لہذا صدر دین صاحب کے دوست راشد کی کار میں خرابی پیدا کی گئی۔ تاکہ وہ صدر دین صاحب سے کار ادھار مانگے۔ پھر اس کے پاس سے بھی کار چرائی گئی اور اس کے میک اپ میں ایک آدمی کیمرو لے کر جالب کریم صاحب کی کونٹری کے آس پاس منڈلانے لگا تاکہ کوئی پولیس کا آدمی یا فوجی آدمی اسے دیکھ کر تعاقب کرے۔ اور کار کا نمبر کم از کم

نوٹ کر لے پھر اس نمبر کے ذریعے تفتیش کرنے والے صدر دین صاحب تک جائیں۔ جہاں نقلی صدر دین صاحب موجود ہوں۔ اور زنجیر کی کہانی سنائیں۔ پھر یہ زنجیر کی کہانی جالب کریم صاحب تک جائے اور وہ صدر دین صاحب کو بلانے پر مجبور ہو جائیں۔ اب جالب کریم کو کیا معلوم کر ان کے پاس اصلی صدر دین کی بجائے نقلی صدر دین آئے گا اور فائل اڑا لے جائے گا۔ یہ ہے کہانی۔ یہاں تک کہ انپکڑ جمشید خاموش ہو گئے۔

”آپ۔ آپ کا مطلب ہے۔ وہ اہم آدمی ہیں ہوں؟
صدر دین نے کانپ کر کہا۔
”کیا آپ کے خیال میں آپ وہ اہم آدمی نہیں ہیں انپکڑ جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔ میں تو رسیوں سے بندھا رہا تھا۔“ وہ بولے۔
”اور آپ کی جگہ ذولان صاحب یہاں تشریف رکھتے تھے۔
یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔“ انپکڑ جمشید بولے۔
”میں نہیں جانتا۔ کہ یہاں میری جگہ کون موجود تھا۔ اس نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

”تب پھر آپ جو کچھ جانتے ہیں۔ وہ بتا دیں۔“
”ہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ کچھ بھی نہیں۔ آپ کی تفتیش غلط راستے پر جا رہی ہے۔ آپ بلا وجہ مجھے بھانسنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ میرا قصور صرت اتنا ہے کہ میں نے اپنے دوست کو کار دے دی تھی اور بس۔ اس کار کی وجہ سے آپ لوگ یہاں آئے۔ لیکن آپ نے خود ہم سب کو بندھا ہوا دیکھا تھا۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں۔ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”میں یہ بات ہرگز نہیں بھول رہا۔ بلکہ میں تو ایک اور بات بھی نہیں بھول رہا۔ وہ مسکرائے۔

”ایک اور بات۔ وہ کیا؟“

”یہ کہ۔“ یہ کہ وہ رکے۔ جالب کریم کی طرف دیکھا

اور بولے :

”اجازت ہے سر۔“

”ہاں ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ اگر صدر دین شارجہ کا

جاسوس ہے اور فائل اسی نے ہی اڑائی ہے تو مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ایلے دوست کو جیل کی سیالوں کے پیچھے دیکھنا پسند کروں گا۔ بلکہ میں تو اس ملک کے ہر دشمن کو جیل کے پیچھے دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ انھوں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”شکریہ سر۔ مجھے آپ سے اسی اجازت کی ضرورت تھی۔ کہ

اصل مجرم کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ تو جناب وہ ایک بات بہت ہی اہم ہے۔ اور اسی ایک بات نے بس

سارے کیس کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ورنہ۔“ ورنہ کہہ کر وہ پھر روک گئے۔ کمرے میں موجود تمام لوگوں کا مارے بے چینی کے بڑا حال تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانه نے بھی اس وقت شدید الجھن محسوس کی۔ کیوں کہ وہ اپنے والد کے اس انداز کو خوب پہچانتے تھے۔

”آپ پھر روک گئے۔“ جالب کریم بولے۔

”ہاں سر۔ وہ اہم ترین بات یہ ہے کہ اس فائل کے بارے میں صرت اور صرت چند بڑے آدمیوں کو معلوم تھا۔ صدر مملکت کو۔ آپ کو اور وزیر داخلہ صاحب کو۔ بس۔ صرت تین آدمیوں کو یہ بات معلوم تھی کہ فائل کہاں ہے۔ یعنی آپ کے پاس ہے۔ اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مجھے بھی یہ بات نہیں بتائی گئی تھی، حالانکہ نگرانی کے لیے مجھے بلایا گیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زولان کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی۔“ انیکٹر جمشید ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ اس بات پر ہی تو مجھے حیرت ہے۔ اور بلا کی حیرت ہے۔ مجرم کو آپ گرفتار کر ہی چکے ہیں۔ اس نے کیا بتایا؟ جالب کریم بولے۔

”مجرم کی گرفتاری بھی ایک عجیب معمہ ہے۔ عجیب انداز

میں اس کی گرفتاری ہوئی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک عجیب بات بتانے کے لیے اس نے گرفتاری دی ہے۔

ورنہ وہ گرفتار ہونے والا نہیں تھا۔

”جی۔ کیا مطلب۔“ محمود، فاروق اور فرزانہ اچھل پڑے۔
”بھئی اچھلو نہیں۔ گر پڑو گے۔ یا پھر ذرا ایک طرف
ہٹ کر بیٹھ جاؤ۔“

”جی۔ ایک طرف ہٹ کر بیٹھ جائیں۔“ محمود نے حیران
ہو کر کہا۔

”ہاں! اس لیے کہ تم اچھلنے سے باز رہ نہیں سکو گے۔
ایسا نہ ہو کہ دوسروں پر گر جاؤ۔“ وہ بولے۔

ان کا انداز اور بھی عجیب ہو گیا۔ محمود، فاروق اور
فرزانہ نے اپنے جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑتی محسوس کیں۔
وہ جلدی سے اٹھے اور کرسیاں تھکے گھسیٹ لے گئے۔
”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زولان کی گرفتاری ایک ڈرامہ
تھی۔ اس نے مجھے جو فائل دی، وہ فائل بھی اصلی نہیں ہے۔
مطلب صرف وہ اہم بات گرفتاری کی صورت میں مجھے بتانا تھا۔“

ورنہ نہ اسے گرفتار ہونے کی ضرورت تھی۔ نہ وہ گرفتار
ہوتا۔ وہ تو بڑ کا بنا ہوا لگتا ہے۔ لیکن وہ گرفتار ہو
گیا۔ اور میں نے اس سے اس کیس کا سب سے اہم
سوال پوچھا۔ کہ آخر اسے یہ بات کس طرح معلوم ہو
گئی کہ فائل جالب کریم صاحب کے پاس ہے۔ اور یہ کہ انھوں
نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اس نے مجھے

کیا بات بتائی۔ یہ کہ وہ ہینٹزم کا ماہر ہے۔ اور اس
نے ہینٹزم کے ذریعے جالب کریم صاحب آپ سے بات
معلوم کر لی تھی کہ آپ نے فائل کہاں رکھی تھی۔
”اوہ اوہ۔“ جالب کریم صاحب دھک سے رہ گئے۔
”لیکن اس کی یہ بات بالکل غلط ثابت ہو گئی۔“ وہ
چانک بولے۔

”کیا مطلب؟“ کمرے میں موجود سب لوگ ایک ساتھ چلائے۔
”جی ہاں۔ بالکل غلط ثابت ہو گئی۔ کیوں کہ اس بے چارے
کو ہینٹزم کی الف بے بھی نہیں آتی۔ میں تجربہ کر چکا ہوں۔
اب سوال یہ ہے کہ اس کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی۔
اس کا جواب ایک اور صورت ایک بنتا ہے۔ اور وہ یہ کہ
سٹر جالب کریم نے یہ بات اسے خود بتائی تھی۔ اور سٹر
جالب کریم ہی شارجستان کے وہ اہم ترین جاسوس ہیں۔“
”نہیں!!!“

کمرے میں موجود سبھی افراد زور سے چلا اٹھے۔
ان کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔ منہ کھلے کے کھلے رہ
گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا سب سے بُرا حال تھا۔
نتیجہ انھوں نے بھی نہیں نکالا تھا۔ اب سب کی
لڑی جالب کریم پر جمی تھیں۔

”انپکڑ جمشید۔ آپ نے مجھ پر بہت خوف ناک الزام

لگا دیا۔ آپ جانتے ہیں۔ میں اس ملک کے کس عہدے پر ہوں۔

”ہاں سر۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی بات کا تو دکھ ہے۔ ہمارے ملک میں کتنے بڑے بڑے عہدوں پر غدار موجود ہیں۔ ان غداروں کی وجہ سے ہی تو ہم پنپ نہیں رہے۔ ترقی نہیں کر رہے۔ اور آئے دن ان گنت سازشوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اسی بات کا تو دکھ ہے مجھے۔“

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے خود زولان کو یہ بات بتائی تھی۔“

”زولان کا بیان۔“

”یہ ایک محب وطن کو پھنسانے کا چکر ہے۔“ شارجتان جانتا ہے کہ میں اس ملک کا بہت خیر خواہ ہوں اور اس کے لیے اپنا تن من وھن سب قربان کر سکتا ہوں۔ اور اس ملک کے لیے بہت کام کر رہا ہوں۔ لہذا اس نے سوچا۔ کیوں نہ ایک تیر سے کئی شکار کیے جائیں۔ لہذا یہ کہہ دیا۔ کہ ہیناٹرم کے ذریعے یہ بات معلوم کی گئی۔ اور پھر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اسے ہیناٹرم نہیں آتا۔“ جاب کریم نے جلدی جلدی کہا۔

”شکریہ۔ میں جانتا تھا۔ آپ یہی کہیں گے۔ ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں۔ آپ بہت محب وطن ہیں۔ اور زولان نے آپ کو پھنسانے کے لیے یہ بات گھڑی تھی۔ اس صورت میں آپ مجھے اپنی کوٹھی کی تلاشی لینے کی اجازت تو دیں گے نا۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے۔ ایک محب وطن کی کوٹھی سے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکتی۔ جس سے وہ شارجتان کا جاسوس ثابت ہو سکے۔ اگر میں آپ کی کوٹھی سے ایسی کوئی چیز برآمد نہ کر سکا۔ تو پھر آپ کی جگہ مجرم میں ہوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔ میں۔ میں تمہیں تلاشی نہیں لینے دوں گا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھا اور جیب سے پستول نکال لیا۔ لیکن اسی وقت اس کے ہاتھ پر کوئی سخت چیز لگی۔ اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ وہ جھٹکا کر پٹا تو فرزانہ مکر رہی تھی۔

”اسی لیے تو آبا جان نے پیچھے ہٹ جانے کا کہہ دیا تھا اور ہم بھی سمجھ گئے تھے کہ مجرم مٹر صدر دین نہیں ہیں۔ آپ ہیں۔ لہذا آپ فوری طور پر کوئی حرکت کریں گے۔“

ادھر محمود پستول اٹھا چکا تھا اور اس کی نال

کا رخ ان کی طرف تھا۔
 ”اُف مالک۔ یہ ہم نے کیا دیکھا ہے۔ کیا سنا ہے۔“ آئی جی صاحب کپکپاتی آواز میں بولے۔
 ”فکر نہ کریں سر۔ یہ سب کچھ ریکارڈ ہو چکا ہے۔ آپ بار بار دیکھ اور سن سکتے ہیں۔“
 ”اس کا مطلب ہے۔ صدر دین صاحب بالکل بے گناہ ہیں۔“

”ہاں جناب۔ ان کا قصور تو بس اتنا ہے کہ یہ جانبِ کریم کے دوست ہیں۔ اور انھیں بھی مہرے کی طرح استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح راشد کو کام میں لایا گیا۔ پھر حمیروز میاں بے چارے کا تو ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن معاملے کو الجھانے کے لیے الجھن کو بڑھانے کے لیے اسے بھی ہلاک کیا گیا اور راشد کو بھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی ایک ساتھی منز شرمجا کو بھی مار ڈالا۔ تاکہ ہم۔ اصل مجرم پر شک ہی نہ کر سکیں۔ اور ادھر ادھر ہی بھٹکتے رہیں۔“

”ہوں! کئی آوازیں ابھریں۔“
 ”آپ کو کچھ کہنا ہے۔“ انپکٹر جمشید نے مجرم کی طرف دیکھا۔

اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ بس

انکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔ لیکن وہ ان چنگاریوں کو بھلا کب خاطر میں لاتے تھے۔
 ”لیکن۔ اب۔ فائل کا کیا بنے گا۔“
 ”فائل زولان نے کہیں چھپائی ہوئی ہے۔ اس کا پروگرام یہ ہے کہ جیل سے فرار ہو کر فائل لے جائے۔ لیکن میں اس وقت اس کی طرف جا رہا ہوں۔ اور اللہ نے چاہا تو فائل حاصل کر کے رہوں گا۔ ہو سکتا ہے۔ مجھے کچھ بہت ہی عجیب طریقے استعمال کرنا پڑیں۔“

دوسرے دن وہ زولان سے فائل حاصل کر چکے تھے۔ اور ہر طرف سے مبارک باد کے پیغامات وصول کر رہے تھے۔ لیکن ان کی یہ مبارک بادیں اس وقت پھسکی پڑ گئیں۔ جب انھوں نے خبر سنی۔ کہ زولان جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ وہ دھک سے رہ گئے۔
 ”خیر کوئی بات نہیں۔ اس سے ایک مقابلہ اور سہی۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”آپ ایک مقابلے کی بات کر رہے ہیں ابا جان۔“ فاروق نے گھبرا کر کہا۔
 ”تو پھر۔“ محمود مسکرایا۔

”میرے خیال میں تو اس سے اُن گنت مقابلہ کرنا

پڑیں گے۔

”اللہ مالک ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”ہم پیدا ہی کس لیے ہوئے ہیں۔ اسلام کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے۔ اور بس۔“ فرزانہ بولی۔

”صرف اسلام کے ہی نہیں۔ اپنے ملک اور قوم کے لیے بھی۔“ محمود نے کہا۔

”اصل چیز اسلام ہے۔ ہم ہیں اسلام ہے۔ تو سب کچھ ہے۔ اسلام نہیں تو کچھ بھی نہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”لیکن اس بار سہرا کس کے سر رہے گا۔“

”صاف ظاہر ہے۔ ابا جان کے سر۔“ فاروق نے فوراً کہا۔

”کیا کہا۔“ بادرچی خانے سے دھاڑتی آواز آئی۔

اور وہ ہنس دیے۔



۲۰۰۰،۰۰۰ روپے کے نقد انعامات

oooooooooooooooooooo

خونفک الزام کا انعامی سوال

سوال: زولان کی کس بات سے انسپکٹر جمشید نے مجرم کو پہچانا؟

○ موصول ہونے والے سب سے پہلے میں درست جوابات پر فی کس

۱۰۰، ۱۰۰ روپے کا نقد انعام روانہ کیا جائے گا۔

○ انعامی سوال کا جواب اسی صفحے کے نیچے دیے گئے کوپن میں لکھیں اور

دیے گئے نشان سے کوپن کاٹ کر مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں:

اشتیاق احمد

دی ۸/۶ ٹیلیٹ ٹاؤن — جھنگ — پوسٹ کوڈ ۲۵۲۰۶

خونفک الزام

انعامی سوال کا جواب:

بھیننے والے کا نام اور پتہ:

بالکل نئے فائدے

● آئندہ ماہ آپ لہروں کی موت پڑھیں گے۔

● آپ ۱۶/۰۰ روپے منی آرڈر کر کے یا ۱۶/۰۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے یہ مہنی خاص نمبر گھر بیٹھے بروقت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح انعامی سوال کا جواب ارسال کر کے ۲۰۰۰/۰۰ روپے کے نقد انعامات میں حصّہ دار بن سکتے ہیں۔

● ۱۶ + ۶ = ۲۲ روپے ارسال کر کے لہروں کی موت کے ساتھ آفتاب احمد کا نیا ناول "نزلے چور" حاصل کر سکتے ہیں۔

● ۱۶ + ۶ = ۲۲ روپے ارسال کر کے لہروں کی موت کے ساتھ چاند ستارے کا نیا شمارہ (قیمت ۹/۰۰ روپے، ضخامت ۱۶۰ صفحات) حاصل کر سکتے ہیں۔

● ۱۶ + ۶ + ۶ = ۲۸ روپے ارسال کر کے آپ لہروں کی موت، نزلے چور اور ماہنامہ چاند ستارے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح ڈاک خرچ کے ساتھ ساتھ آپ کو پانچ روپے کی رعایت ہو جائے گی۔ اور رسالہ اور ناول گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

● ۵۰/۰۰ روپے قیمت والے پرانے ناول منگوانے کے لیے فی ناول ۴/۰۰ روپے کا اضافہ کر کے رقم ارسال کریں۔

===== ہیں نا بالکل نئے فائدے =====

۲۰۰۰۰۰ روپے کے نقد انعامات

آئندہ ناول کی ایک جھلکی

۲۰ اگست کو پڑھیے

قیمت ۱۶/۰۰ روپے

منی خاص نمبر

محمود، فاروق، فرزانہ، انیسٹر جمشید،

آفتاب، مصطفیٰ، فرحت اور انیسٹر کامران مرزا



لہروں کی موت

مصنف: اشتیاق احمد

○ ریاض گومی کے گھر ایک عجیب آدمی کی آمد —

- اس عجیب آدمی کی بات بھی بہت عجیب تھی۔
- پھر اس کی وہ عجیب بات درست بھی ثابت ہو گئی۔
- ریاض گومی نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا، لیکن پولیس والے بھی اس عجیب آدمی کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔
- یہاں تک کہ معاملہ اعلیٰ حکام تک جا پہنچا۔ اعلیٰ حکام بھی اسے سزا نہ دے سکے۔
- اس نے پورے شہر میں کھلبلی مچا دی۔
- کھلبلی مچانے والا سب کے سامنے تھا، لیکن کوئی اسے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔
- آخر کیوں۔ یہ سوال بہت دل چپ ہے۔ اور اس کا جواب ...
- جواب تو آپ ناول پڑھ کر ہی معلوم کر سکیں گے۔
- پھر پورا شہر ایک حیرت انگیز اور خوف ناک ترین معاملے کی پلیٹ

ب نیا پروگرام ترتیب دیا۔
ح خلافت ہو گئے۔
مرکز بھی نہ دیکھ سکے۔
ر انصوں نے تو موت کے



- ایسے لوگ تو میدان چھوڑ کر کبھی بھاگے ہی نہیں۔
- جیروں سے ہریز ناول۔ جو آپ کو پہلے صفحے سے ہی اپنی گرفت میں لے لے گا۔
- آپ مجرم کی تلاش میں اپنا ذہن دوڑاتے نظر آئیں گے۔
- لیکن مجرم۔ کون تھا؟ کہاں تھا؟ کیا چاہتا تھا؟ یہ سب سوالات آپ کو اس قدر بے قرار کر دیں گے کہ ناول ختم کرنے پر تیل جائیں گے۔ اور آپ کو پرانا اشتیاق یاد آ جائے گا۔
- اور ————— اب انعامی سکیم:
- ۲۰۰۰ روپے کے نقد انعامات۔
- ۲۰ درست جوابات پر۔
- سب سے پہلے موصول ہونے والے بیس درست جوابات پر فی کس ۱۰۰، ۱۰۰ روپے کا نقد انعام۔
- انعامات جواب کا اعلان ہونے کے فوراً بعد روانہ کر دیے جاتے ہیں۔
- آپ فوری طور پر ناول حاصل کرنے کی ترکیب کر لیں۔
- ۱۶/۰۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ دفتر کے پتے پر ارسال کریں۔ ناول آپ کو بذریعہ رجسٹری عین وقت پر گھر بیٹھے مل جائے گا۔
- یا اپنی کاپی بک شال پر بک کروالیں۔
- یا اپنے ہا کر کو نوٹ کروالیں۔
- یا پھر ٹیک ۲۰ اگست کو بک شال کا رخ کریں۔

آئندہ ناول کی ایک جھلک

انپکٹر ارسلان سیریز ۲۶

نرالے چور

— مصنف: آفتاب احمد —

- چوروں کا شہر، جس میں پچیس ہزار چور تھے۔
- روٹا گروہ نے پورے ملک میں پھیل چا دی۔
- روٹا — روٹن — روٹام —
- انپکٹر ارسلان نے شہر میں داخل ہوتے ہی باس پر ہاتھ ڈال دیا۔
- وہ شہید کوٹ کو چوروں سے نجات دلا کر گھر لوٹے ہی تھے کہ انہیں
- ایک مشن پر جانا پڑا۔ ایک ناول دو پلاٹ —
- ایک دشمن مصنف — اچانک کہانی ایک انوکھا موڑ کھاتے گی اور پھر
- آپ حیرت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ حیرت اور خوف
- اس وقت مزید بڑھ جائے گا، جب آپ فرشتوں سے ملیں گے۔
- آخر میں آپ کے رنگ اڑ جائیں گے۔

قیمت : ۸/۰۰ روپے

پچھلے کے اردو ادب کا ترجمان

چاند ستارے

آزادی نمبر شائع ہو گیا ہے

oooooooooooooooooooo

اگست ۸۹ء کے شمارے کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

- آزادی کی قیمت — یہ تحریر آپ بھلا نہیں پائیں گے۔
- ۴۴ کمانڈرز — آفتاب احمد کی چاند ستارے کے لیے پہلی کہانی،
- جاسوس باپ کے چار جاسوس بیٹوں کی داستان —
- آدھا انصاف — کیا وہ ظلم انصاف تھا؟ یا وہ انصاف ظلم تھا؟
- پاکستان اور فوجی تربیت — ضرورت اس کی ہے۔
- جمشید کی واپسی — قسط نمبر ۱۰، کہانی ایک نئے موڑ پر۔
- پاکستان — ایک نیا سلسلہ معلومات —
- ذہن کے غلام — وہ اس کفن کا حق دار بھی تھا؟

۲۰۰۰ روپے کے نفت انعامات

پیغام کا بھوت

کا انعام

سوال یہ تھا: انپیکٹر جمشید صد ۱۵۲ پر سیٹھ قاسم کے گھر کیوں گئے تھے؟
جواب: ان کے چہروں کے تاثرات دیکھنے گئے تھے۔

○

انعام پانے والے بیرے قادیان۔ مبلغ ۱۰۰/۰۰، ۱۰۰/۰۰ روپے روانہ
کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

○ سعید ساجد، مکان نمبر ۸۱، سٹریٹ نمبر ۳، یاسین آباد، پیپلز کالونی نمبر ۲
فیصل آباد

○ محمد رافت اختر ولد محمد جاوید اختر، شمع اسلام سکول رائے ونڈ، ضلع لاہور

○ ایس ارشد خان، مکان نمبر ۹۰، بلاک ۲/سی لائن نمبر ۳، لطیف آباد،

حیدر آباد

○ سید شہاب الدین شاکر، ۶۳۰/۱۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

○ ذوالفقار علی، حمید خان انٹر پرائز، ۴۱، لوتھ مال، بیرون بھائی گیٹ، لاہور

○ محمد زاہد، ۳۵-سی بوستان، میر کراچی ۴۳

○ محمد ندیم جہانگیر، مکان نمبر ۳۲۸/جی، کوچہ چرانگراں، اندرون دہلی گیٹ

لاہور

○ مختار علی ولد محمد صنیعت، ۱۹ چیمبر لین روڈ، احاطہ حاجی قادر بخش، لاہور۔

○ عدنان اشرف، نیاز منزل، کوارٹر نمبر ۲۱، وحدت کالونی، ڈسپوزل روڈ

گوجرانوالہ

○ میاں مسعود اختر، کوٹ خزان سنگھ، منڈی رائے ونڈ، ضلع لاہور

○ یاقوت بک ڈپو، چوک کوتوالی، عید گاہ روڈ، فیصل آباد

○ شفیق الرحمن، ۵۰ ایکس-۲ مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

○ محمد کاشف جاوید، مکان نمبر وی ۱۱/۳، سٹیل ٹاؤن، جھنگ

○ وقار احمد، مکان نمبر کے ۴۲۲، نظرقالحق روڈ، راولپنڈی

○ محمد امین اسلم، وارث سٹریٹ، بابو صابو، بند روڈ، لاہور ۲۵

○ محمد ادریس قریشی، مکان نمبر ۵/۲۲، وارڈ نمبر ۵، منڈی بہاؤ الدین،

ضلع گجرات

○ ارشد علی معرفت عباسی پرویز سن سٹور، بند کھنڈ روڈ، صغیر منزل، مسلم ٹاؤن،

راولپنڈی

○ شہزاد عمران ولد مشتاق احمد، گلی اسحاق ایڈووکیٹ، کھوکھر کی، گوجرانوالہ

○ حافظ محمد سلیم اصلاحی، اے-۳۷، ایکب پارک، بیر بہاول شیر روڈ، مزنگ، لاہور

○ شاہد اقبال، نزد رحمانیہ مسجد، بخاری روڈ، گوجرانوالہ

مسئلہ ختم نبوت

مرزا قادیانی کا سفید جھوٹ ۵

XXXXXXXXXXXXXXXXXXXX

مرزا غلام قادیانی اپنی کتاب کشتی نوح میں لکھتا ہے :
 "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسیح موعود میری قبر میں دفن ہوگا،
 یعنی وہ میں ہی ہوں اور اس میں دورنگی نہیں آئی اور تم یقیناً سمجھو کہ
 عیسیٰ بن مریم فوت ہو گیا ہے (استغفر اللہ) اور کشمیر، سری نگر، محلہ غانیار میں
 اس کی قبر ہے۔"

چند جملوں کی اس تحریر میں مرزا نے کئی سفید جھوٹ بولے ہیں... یہ تحریر
 واضح طور پر مرزا کو جھوٹا ثابت کر رہی ہے... ملاحظہ فرمائیں کہ کیسے !
 حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میرے
 ساتھ دفن ہوں گے... حدیث شریف میں لفظ مسیح موعود کا نہیں، عیسیٰ ابن
 مریم کا ہے... اور مرزا لکھ رہا ہے کہ عیسیٰ بن مریم فوت ہو گیا ہے اور
 کشمیر میں دفن ہے (استغفر اللہ) پھر خود ہی لکھتا ہے کہ وہ میں ہوں جو
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں دفن ہوں گا...

لیکن... مرزا قادیانی قادیان میں دفن ہے... اب مرزائیوں سے
 ہمارا سوال یہ ہے :

"وہ کون ہوگا... جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے میں دفن ہوگا؟ (پہلیج)
 (کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو پورا ہو کر رہے گا)

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
 آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اگر آپ

ایک طالب علم ہیں اور آپ کے دل میں انسانیت سے
 محبت کا جذبہ اور دکھی لوگوں کی خدمت کا شوق موجود
 ہے تو پھر ہمیں آپ کی ہی تلاش تھی... ایس۔ وی۔ جی
 (اشارہ الینٹری گروپ) آپ جیسے طلباء ہی کی جماعت ہے۔

○

مزید تفصیلات اور فارم منگوانے کے لیے جوابی لفاظی ساتھ ارسال کریں:

محی الدین

چیف سیکرٹری (ایس۔ وی۔ جی)

۱۷/۲ عزیز آباد — فیڈرل بنی ایریا — کراچی-۳۸

پوسٹ کوڈ نمبر ۷۵۹۵۰